○ نام کتاب : نشاطِ الم
○ مصنف : رؤف رحیم
○ صفحات : (۱۱۲)
○ سن اشاعت : ۱۹۹۶ء
○ تعداد : (۵۰۰) پانچ سو
○ کتابت : محمد عبدالرؤف
○ طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
○ جلدبندی : حفیظیہ بک بائینڈنگ چھتہ بازار
○ ناشر : ادبستانِ دکن، بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی
○ زیرِاہتمام : جناب محبوب علی خاں اخگر
○ قیمت : Rs 50/= ۵۰ روپے، لائبریریز کیلئے Rs 80/=
○ سرورق : سعادت علی خاں بیرون ممالک : 10 ڈالر

یہ کتاب اُردو اکیڈیمی آندھراپردیش کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

ملنے کے پتے :

○ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد۔
○ اسٹوڈنٹ بک ڈپو، چارمینار حیدرآباد۔
○ دفترِ شگوفہ۔ بیچلر کوارٹر معظم جاہی مارکٹ۔
○ بتوسط احمد شمس الدین مکرم فرزند رؤف رحیم ۲۰-۵-۵۲۵ شکر گنج حیدرآباد

فہرست



استاد محترم ماہرِ علم عروض حضرت سیّد نظیر علی عدیلؔ مرحوم
جن کی ہدایات میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اور

میرے مشفق محترم محقق دکن نواب محمد نورالدین خاں صدر
ادبستانِ دکن کے نام۔

رؤف رحیم
(ایم اے)

از۔ رؤف رحیم مصنف

پیش لفظ ۔ اپنے بارے میں

قارئین کرام!

"نشاطِ الم" سے قبل میرے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس کی آپ نے پذیرائی کی۔ سنجیدہ غزلیات کا مجموعہ "بساطِ دل" فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ اتر پردیش کی مالی اعانت سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا جسے اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام سے نوازا۔ اسی ہمت افزائی نے مزاحیہ غزلیات کے مجموعہ "خدا خیر کرے" کی اشاعت کے لیے راغب کیا۔ جو اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش میں ۱۹۸۹ء کے مسودات کی منظوری کے بعد ۱۹۹۱ء میں جزوی اعانت سے شائع ہوا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے بھی جزوی مالی اعانت کی اور خدا خدا کر کے "خدا خیر کرے" منظر عام پر آیا اور اس کی بھی پذیرائی ہوئی۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام اور اعزاز سے نوازا۔ وزیر تعلیم مسٹر پی وی رنگا راؤ نے توصیف نامہ اور میڈل عطا کیا۔ جس کے لیے میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا ممنون ہوں۔

شاعری یوں تو خدا داد صلاحیت ہے لیکن ماحول اور فیضِ صحبت سے یہ اور نکھرتی ہے۔ میری شاعری کا آغاز ۱۹۷۶ء میں ہوا جو والدِ مرحوم حضرت شمس الدین تاباںؔ کے فیضِ صحبت نظرِ کرم اور شفقتِ پدرانہ کا اثر تھا۔ میرے تعارف کے لیے یہی کافی ہے کہ میں دکن کے ممتاز شاعر حضرت محمد شمس الدین تاباںؔ کا چوتھا لڑکا ہوں جو حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے شاگردِ رشید تھے۔ ۱۰ جون ۱۹۵۴ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوا سائنس سے گریجویشن کرنے کے باوجود اردو ادب سے ایم اے کیا۔ شاعری وراثت میں ملی (شعر نہیں) ذوق شاعری کی چنگاری کو ماحول کی ہوا نے شعلہ بنا دیا اور کم عمری سے ہی شاعری پر شباب آنے لگا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۸۵ء کو والدِ محترم حضرت تاباںؔ نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا تب تک میں ان ہی کے سایۂ شاگردی میں تھا۔ والد صاحب کی شاگردی کے بعد

حضرت سید نظیر علی عدیلؔ کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے اور ان کے انتقال تک انہی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا حضرت عدیلؔ فنِ عروض پہ یدِ طولیٰ رکھتے تھے بڑے گوی دا استاد حضرت صفیؔ مرحوم سے لے کر حضرت عدیلؔ کی غائبانہ اور حاضرانہ صحبت کا فیض ہے اسی لیے ۱۰ سال کے عرصہ میں تین مجموعے ہائے کلام شائع کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے نثری مجموعے زیرِ ترتیب ہیں افسانے ڈرامے سنجیدہ مضامین مزاحیہ مضامین انٹرویوز وغیرہ کی اشاعت زیرِ غور ہے۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو جس کی بنیاد شاعر و عاشق بادشاہ قلی قطب شاہ نے ڈالی تھی، مشاعروں اور شاعروں کا شہر کہا جائے تو بے جا ہو گا۔ مہینے میں اوسطاً چھ مشاعرے ہوا کرتے ہیں اور زیادہ تر طرحی جس کے باعث نئی غزلوں میں خوشگوار اضافہ ہوتا رہتا ہے ۱۹۷۶ء سے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوا اب شاعری سنِ بلوغ کو پہنچ گئی ملک اور بیرون ملک کے تقریباً رسائل میں میرا کلام شائع ہونے لگا شہر اور بیرون شہر کے مشاعروں میں کلام کو پسند کیا جانے لگا دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو سے کلام کے ساتھ ساتھ نام کی تشہیر بھی ہونے لگی۔

ادارۂ ادبستان دکن بہ یادگار حضرت صفیؔ اورنگ آبادی (جس کے بانی میر سے والد حضرت تاباںؔ تھے) کا معتمد عمومی ہوں صدر جناب نورالدین خاں کی رہنمائی میں اس ادارہ کی جانب سے حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے کلام اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے "گلزارِ صفی" کی اشاعت اور سوانح عمری حضرت صفیؔ اورنگ آبادی مصنف نواب نورالدین خاں کے علاوہ جناب محبوب علی خاں اخگر کی کتاب "تلامذۂ صفی اورنگ آبادی" ادارہ کے سلسلہ مطبوعات میں سے ہے جنھیں پڑھ کر حضرت صفیؔ کی زندگی کے تمام پہلو روشن نظر آتے ہیں۔ اصلاحاتِ صفیؔ کے عنوان سے والد مرحوم نے تقریباً تیس سال قبل "ملاپ" میں شاگردوں کے کلام پر حضرت صفیؔ کی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تھا جناب اخگرؔ نے اپنی کاوشوں سے اصلاحاتِ صفیؔ کو مکمل کر کے شائع فرمایا۔ بہرحال "ادبستانِ دکن" دکن کے شعراء کے نام اور کلام کو باقی رکھنے کا جو بیڑہ اٹھا رکھا ہے اس کو میں اپنا اعزاز سمجھتا ہوں

پاسبانِ ادب کا بھی معتمد عمومی ہوں۔ "بساطِ دل" میں مرحوم نقاد، شاعر جناب عزیز قیسی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا نیز ڈاکٹر سیدہ جعفر اور جناب احمد جلیس مرحوم نے اپنے زرین خیالات سے میری ہمت افزائی کی تھی نیز اُس پر تبصروں کا ایک خوشگوار سلسلہ جاری رہا پھر "خدا خیر کرے" پر ملک کے ممتاز ادیب جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر مجید بیدار ممتاز شعراء ساغر خیامی رضا نقوی واہی اور دوسروں نے میرے کلام کو سراہا اور اتنی ہمت افزائی کی کہ "نشاطِ الم" آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

میں اس مجموعہ کی اشاعت میں تعاون کرنے والوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بے حد ممنون ہوں کہ وہ ادبی، سیاسی، سرکاری اور خانگی مصروفیات سے وقت نکال کر میرے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا مجھے خوشی ہے کہ اُنھوں نے "بساطِ دل" اور "خدا خیر کرے" کو بھی اپنے ساتھ رکھ کر میرے کلام کا جائزہ لیا۔

میں اپنے استادِ محترم حضرت سید نظیر علی عدیل مرحوم کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے نہ صرف میرے کلام پر اصلاح دی بلکہ اپنے تاثرات سے میری ہمت افزائی فرمائی۔

میں مشکور ہوں ان تمام اصحاب اور اداروں کا جنھوں نے میری ہمت افزائی فرمائی کہ میں اس قابل بنا کہ میرا تیسرا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے والد مرحوم شمس الدین تاباںؔ استادِ محترم سید نظیر علی عدیل مرحوم کی دُعائیں بھی شامل رہیں نیز کتاب کی اشاعت میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے جزوی مالی تعاون کا بھی دخل ہے جناب حسن چشتی کا بھی میں مشکور ہوں جنھوں نے میری شاعری کو بین الاقوامی شہرت عطا کرنے میں اپنا تعاون دیا۔ جناب نور الدین خاں، جناب روحی قادری اور جناب مظفر مجاز کے مشوروں کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جناب محبوب علی خاں اخگر نے کتابت طباعت میں جو بے لوث خدمت کی اس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

اُمید کہ قارئین میری اس کوشش کی ستائش نہ بھی کریں تو ہمت شکنی نہیں کریں گے۔

رؤف رحیم

ہر کربِ انبساط کو ٹھکرا چکا ہوں میں
تو بھی اب نشاطِ الم ساتھ دے نہ دے

(مظفر مجاز)

نشاطِ الم

محمد نورالدین خان

"رؤف رحیم کی شاعری"

جناب محمد رؤف رحیم الدین المعروف رؤف رحیم میرے ہم محلہ بزرگ دوست جناب شمس الدین تاباں کے فرزند اور چشم و چراغ ہیں۔ بربنائے روابطِ قدیم انہیں میں ان کے لڑکپن سے جانتا ہوں اور ان کی شعری صلاحیتوں کا رمز آشنا ہوں جناب تاباں دکن کے بہت اچھے شاعر اور استادِ سخن صفیؔ اورنگ آبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ ان کے حلقۂ احباب میں تھے شاعروں کے تذکرے اور شعر و شاعری کے چرچے گھر میں چلتے رہتے۔ ایسے ماحول میں جناب تاباں کے دونوں فرزند یحییٰ جمیل اور رؤف رحیم پل کر جوان ہوئے اور پھر ذہنی تربیت کی نشو نما۔ شاعرانہ حس کو متحرک کرنے اور صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں جناب تاباں کا فیضانِ نظر کارفرما رہا اس فیض رسانی کا اثر اور طفیل ہے کہ دونوں بھائی شاعر ہیں اور دادِ سخنوری دے رہے ہیں ـــــ یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب رؤف رحیم کو شعر و ادب کی بڑی اچھی صلاحتیں قسامِ ازل نے عطا کی ہیں اور خود انھوں نے اپنے ذاتی ذوق و شوق بے پناہ دلچسپی لگن اور جستجو سے شغلہ شعر و شاعری کو اپنایا۔ آج وہ ایک اچھے اور منفرد انداز کے شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں۔

اس جواں سال شاعر کی طبیعت کا بھی عجیب الوکھا پن ہے جس کے ذہن و فکر کی دنیا میں غم اور خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اجتماعِ ضدین ان کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے سنجیدہ نظم و نثر اور مزاحیہ نظم و نثر لکھنے میں انہیں بڑی مہارت ہے۔ اس فن کو اس خوبی سے نباہتے ہیں کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انہیں سنجیدہ نگار کہیں یا مزاحیہ نگار۔ طرحی مشاعروں میں طرح پر سنجیدہ اور مزاحیہ غزل دونوں میں طبع آزمائی کرکے

رؤف رحیم میری نظر میں

جناب رؤف رحیم کا شمار حیدرآباد کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ اپنی اوائل عمری سے شعر کہتے ہیں جس کے باعث اُن کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں طنز و مزاح اور سنجیدہ ادب دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں طبیعت میں انکسار اُنھیں ورثہ میں ملا ہے حضرت شمس الدین تاباںؔ کے فرزند ہیں اُن کی تعلیم اور خصوصًا تربیت نے ان کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بھی نکھارا ہے بزرگوں سے مودبانہ ملتے ہیں اور اپنے ہمعصروں سے خندہ پیشانی کے ساتھ۔ انکسار میں خودداری کا دامن نہیں چھوڑتے۔ گروپ بندی کے خلاف ان کا جہاد جاری رہتا ہے تمام مکاتیب خیال کے شعراء کو اپنے جائز مقام دلانے کے خواہاں رہتے ہیں۔ نشاطِ الم اُن کے سنجیدہ کلام کا مجموعہ ہے کلام میں پختگی، بے ساختگی اور تمام فنی لوازمات موجود ہیں جس پر حضرت تاباںؔ سے لے کر حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کا پرتو نظر آتا ہے زبان شائستہ اور خیالات پاکیزہ ہیں۔

اردو ادب میں بہت کم شعراء ہیں جو طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری پر یکساں دسترس رکھتے ہوں۔ جناب رؤف رحیم بہت لکھتے ہیں بہت سے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے ہیں تمام شعراء سے ربط اور ان کے کام آنے کے جذبہ کی باعث ہر دلعزیز ہیں شاعری کے علاوہ نثر نگاری کا بھی شغف ہے۔ افسانے ڈرامے، انٹرویوز اور مضامین کا ایک کثیر ذخیرہ موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کا زیر نظر مجموعہ عوام میں مقبول ہوگا اور ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام حاصل کرے گا۔

نصیب منشن جہاں نما حیدرآباد　　　محبوب علیخاں اخگرؔ قادری

بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ غزل کی رومانی فضاء ہے۔

لیکن غزل نے کئی منزل طے کئے اور اب بھی مائل بہ ارتقاء ہے ایسے ہی جب جب نے سماج کے ارتقاء کے ساتھ کئی۔ بنازل طے کیے۔ غزل ابتداء میں صرف معشوق سے بات چیت (بلکہ چھیڑ چھاڑ) اور رقیب سے نوک جھونک سے عبارت تھی اور یہ خصوصیت آج بھی پائی جاتی ہے پھر اس میں ابتذال آیا۔ مواد سے زیادہ بیان پر توجہ مرکوز ہوگئی۔ گویا ذہن سے زیادہ جہیز پر نظر پڑنے لگی۔ پھر عورت ایک کھلونا بن گئی اور غزل "تھکے ہوئے" نوابزادوں کے لیے "حب سلاجیت" کا کام کرنے لگی۔

پھر نشاۃ ثانیہ اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ساتھ غزل نے بھی انگڑائی لی۔ حسرت موہانی کے ہاتھوں پھر سے پاکیزگی حاصل کرلی اور اب غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ کبھی اِشارتاً اور کبھی براہِ راست انداز میں "غمِ دوراں" اس کا مواد بن گیا اب محبت کے دائرے وسیع ہوتے چلے گئے شاعر معشوق کی یاد میں کھویا کھویا سا جارہا تھا کہ راہ میں ٹھوکر لگی اور یہ ایک مفلوک الحال انسان کی لاش تھی شاعر کو جھٹکا سا لگا۔ رحیم نے "بساطِ دل" میں کہا ہے

خون سے سینچتے ہیں کھیتوں کو ٭ حق نہیں جن کا چار دانوں پر!

اب عشق کی منزلیں ہوگئیں۔ فراق کے نزدیک وہ اپنی انتہا پہنچ کر شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے مابین رابطہ بن جاتا ہے یعنی حقیقت موجود اس سے ناآسودگی کا احساس اور پھر حصول آسودگی کی خواہش کروٹیں لینے لگتی ہے۔ عشق نے شاعر کو موصفت بنا دیا۔ اب وہ "غمِ دوراں" کو اپنا غم سمجھنے لگا۔ پہلے شاعری عشق مجازی سے شروع ہوکر عشق حقیقی پر ختم ہوتی تھی اور اب غمِ ذات سے شروع ہوکر غمِ کائنات کو اپنے اندر سمیٹ کر نئی خوشبوؤں کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔ بقول فیض شاعر کا کام قطرہ میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دوسروں کو دکھانا بھی ہے اور پھر اپنے شعور اور حوصلے کے مطابق دجلہ کے بہاؤ کو سماجی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا بھی ہے۔

"نشاطِ الم" ہی دیکھ ڈالیے آپ کو ٹھیٹ رومانی غزل کے اشعار ملیں گے۔

اُن کا نظریں جھکا کے چپ ہونا ؛ سو سوالوں کا اک جواب ہوا

اور یہ شعر ؎

زُلف ہے رُخسار پر چھائی ہوئی ؛ دن تصدق ہے تمہاری شام پر

پھر یہ شعر ؎

بادل سمندروں پہ برس کر چلے گئے ..... ؛ جیسی کی ویسی رہ گئی پھر جنگلوں کی پیاس

اس شعر کو جتنی بار پڑھیئے معنوں کی تہیں کھلتی جائیں گی۔ بادل کو اسی جگہ برسنا تھا جہاں بکثرت پانی پہلے ہی سے موجود ہے جنگلوں کی طرف توجہ نہیں کی یہاں نہ صرف درختوں کو اس کی ضرورت ہے بلکہ ان ہی جنگلوں میں ایک صحرا نورد "عاشق" مجنوں بھی پیاسا ہے اور اس کا حلق تر نہ ہوا یہ بادلوں کی تنگ دامانی بھی ہے اور عاشق صادق مجنوں کی محرومی بھی سوچیئے تو عصری سماج کی ناانصافی کی طرف اشارہ بھی ہے غزل کا یہ شعر دیکھیئے۔ ؎

پالیائیں نے وفاؤں کا جواب ؛ خط میں ان کے پھول تھا سوکھا ہوا

خط لکھا۔ اس میں محبت اور عقیدت کا پھول رکھا پھر خط بھیجنے میں تاخیر کی طرف اشارہ دیکھیئے "خط بھیجوں نہ بھیجوں"؟ کا تذبذب ملاحظہ کیجیے یہ پھول سوکھ گیا۔ لیکن یہی ان کی "وفاؤں" کا ثبوت بھی ہے۔ عشق تو ہے لیکن اظہار کی جراَت شاید کم ہے۔ دل و ذہن کی آویزش نے کیا حال بنا رکھا ہے؟

رحیم کے اطراف و اکناف کرب بھی تو ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

کس لیے منڈلا رہے ہیں گدھ یہاں ؛ کیا کوئی بھوکا مرا ہے شہر میں

اور یہ شعر۔ شعر نہیں سماج کے ناسور پر نشتر ہے۔

کُتوں کو سلاتے ہیں وہ بستر ہی پہ اپنے ؛ مفلس کو جو دہلیز پہ سونے نہیں دیتے

کشتی میں بیٹھ کر سمندر پار کر جانا سمندر کو دیکھنا اور پرکھنا نہیں ہے موجوں کے اتار چڑھاؤ کے سامنے بہہ جانا بھی سمندر کی گہرائی کا پتہ نہیں دیتا۔ سمندر زندگی کی علامت ہے۔

گہرائی میں موجوں کی اُتر کر نہیں دیکھا ؛ کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

فراق نے کہا ہے۔

نشاطِ الم

انسان نے خدا کو جب بنالیا تو فراق ؛ پکار اُٹھا کہ خدا نے مجھے بنایا ہے

اب رحیم کو سُنیئے اسی راستے پر گامزن معلوم ہوتا ہے۔

اس سے دنیا وجود میں آئی ! ؛ آدمی وجہِ انقلاب ہوا !

آج کے انسان میں "شق البشر" کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ سماج سے کٹ رہا ہے بکھر رہا اس کی زندگی اس کے ارمانوں کا مزار بنی ہوئی ہے وہ ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے جس میں چہرہ بجھا ہوا اور مسخ ہی نظر آئے گا۔

اپنا چہرہ مجھ میں دیکھے کیوں کوئی ؟ آئینہ ہوں ٹوٹ کر بکھرا ہوا

کیا انسان مجبور ہی ہے یا مختار بھی ؟

کوئی سمجھ نہ پایا کہ انسان اصل میں مجبورِ زندگی ہے کہ مختارِ زندگی

پھر رحیم اس تذبذب کی حالت میں بہت دیر نہیں رہتا

رہِ منزل میں بڑھتا ہے رحیم اک شیوۂ مرداں
وگرنہ لوٹ کر گھر کو تو اِک اندھا بھی آتا ہے

اور رحیم جینے کے لیے یا جہادِ حیات میں حوصلے کہاں سے حاصل کرتا ہے ؟

اب غمِ عشق کی دولت سے نوازا ہے مالک
غمِ دوراں سے تو برسوں کی شناسائی ہے

"غمِ دوراں" سے برسوں کی شناسائی ہے سوال اس سے آویزش کے چیالنج کو قبول کرنا ہے اور "غمِ عشق" ہی سے رحیم حوصلہ حاصل کرتا ہے یہاں غمِ عشق اور غمِ دوراں کا ربط بھی واضح ہوجاتا ہے۔ "ماہتاب" کے فریب میں ہمارا شاعر ازل سے مُبتلا رہا ہے۔ ایک نشاطِ نامعلوم کا احساس ماہِ کامل سے ہوتا ہے وہی معشوق تھا اور اسی کی چاندنی سے ایک طرف سمندر کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی تھیں تو دوسری طرف جنونِ عشق بھی تیز ہوتا تھا۔ لیکن

جب سے تسخیرِ ماہتاب ہوئی ہیچ نظروں میں ماہتاب ہوا

فریب ٹوٹا۔ نشاطِ نامعلوم غائب ہوا۔ سمندر کی موجیں اب خاموش ہیں عشق میں جوار بھاٹا اب نہیں ہوتا آدؔ تو طلسم بھی زندہ رہنے کے لیے ضرور ہے۔

"انا" رحیم کا خاص موضوع معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے۔

اچھی ہے رحیم اتنی لازم ہے انا جتنی — بڑھ جائے اگر حد سے پستی میں گرا دے گی

حصارِ ذات سے باہر نکل نہیں سکتا — اسیرِ زلفِ انا ہے وہ پارسا کب ہے

آدمی سانپ بن کے ڈس لے گا — حد سے آگے انا نکلتے ہی

عصری حقیقتوں کی تلخی کو کیسے پیش کیا ہے؟

کیا باغباں نے یہ گلشن کا عالم — نہ پھولوں میں خوشبو نہ ہی تازگی ہے

ہماری طبیعت میں جو برہمی ہے — یہ بے حس زمانے سے ہم کو ملی ہے

لگا یا ہو چہرے پہ چہرہ نہ اس نے — وہ رہزن ہے یا راہ بر دیکھئے گا

انجام گلوں کا انھیں جب سے نظر آیا — حساس نگاہوں نے گلِ تر نہیں دیکھا

قتل بھی ہم ہی ہوئے قاتل بھی ٹھہرائے گئے — مجرمانِ وقت ہی ہم کو سزا دینے لگے

دھوپ سایہ اور شجر کا اعجاز دیکھنا ہو تو رحیم کے یہ شعر دیکھئے۔

دھوپ ڈھل جائے تو پھر سایہ کہاں — دھوپ سایے کو اٹھا لے جائے گی

یہ علامت ہے کہ سورج ہے تنزل کی طرف — اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایہ اپنا

کڑی دھوپ سہہ کر بھی دیتا ہے سایہ — ہے بے لوث کتنا شجر دیکھئے گا

چاند تو بھیک کا نور اور مانگے کے اجالے میں مگن ہے لیکن چاند سورج ہی سے تو بھیک کی یہی روشنی لے کر اس میں اپنے دل کی ٹھنڈک بھر دیتا ہے اور ہمیں خوشگوار چاندنی نصیب ہوتی ہے "روشنی" کی اس کایا کلپ کو سورج کی گرمی سے چاندنی کی ٹھنڈک تک بدل جانے کے راز کو سمجھنے کے لیے رحیم کو سنیئے۔

سورج کی روشنی جو قمر تک نہ آئے گی — پھر چاندنی کسی کے بھی گھر تک نہ آئے گی

ایک پرانا خیال ہے جو ضرب المثل بن گیا ہے۔ رحیم کو سنیئے۔

غیروں کی آنکھ کا ہمیں تنکا دکھائی دے — مشکل ہے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنا

آج ملک جن "دھاکوں" سے گزر رہا ہے وہ رحیم کے اشعار کا جز بن چکے ہیں سنیئے۔

کٹ رہے ہیں سو سال فصلوں کی مانند آجکل — مار ہمارے دلیش کی دھرتی ترقی از رخنہ سے

یہ دورِ دھماکو ہے اسی واسطے اسد ہم بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے نہیں دیتے

یوں دھماکے ہو گئے معمول اپنے ملک میں اب پٹاخے بھی ہمارا دل ہلا دینے لگے

لگانے والے مرے گھر کو آگ سوچ ذرا لگا ہوا مرے گھر سے ہی خود ترا گھر ہے

اس بار خاک ہو گئے بستی کے سارے گھر ملتا نہیں ہے اپنے ہی گھر کا پتہ مجھے

میں جانتے ہوئے قاتل کو ہوں جو مہر بہ لب اسی سے خون کا رشتہ ہے کیا کیا جائے ؟

ے مسجدیں ٹوٹ کر مندریں ٹوٹ کر اینٹ پتھر سے بن جائیں گے پھر، مگر!
ان دلوں کا بتاؤ کہ کیا حال ہو جو فسادوں میں ٹوٹے ہوئے رہ گئے !

کبھی خلوص کی شمعیں جلائی جاتی تھیں ہمارے شہر میں اب گھر جلائے جاتے ہیں

مناظر دیکھ کے جلتے گھروں کے نظر ڈرنے لگی ہے روشنی سے

یہ تو رحیم کے شعری مجموعے "نشاطِ الم" کا صرف ایک تعارف تھا اس کے آگے وسیع امکانات ہیں خود وہ کہتا ہے۔ ے

دیکھنا ہے آگے آگے کیا قیامت ڈھائے گی
یہ عروسِ شاعری میری ابھی نوخیز ہے

حیدرآباد۔ ۱۵ راگست سنہ ۱۹۹۳ء

راج بہادر گوڑ

پروفیسر عنوان چشتی

تاثرات

رؤف رحیم اردو کے اُن شاعروں میں شامل ہیں جو صرف اپنے لیے شاعری نہیں کرتے بلکہ اُن کی نگاہ میں شاعری کا ایک سماجی مصرف و منصب بھی ہے اِس لیے رؤف رحیم کی غزلیں رسائل کی زینت بھی بنتی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے تخلیقی تجربات میں دوسروں کو شرکت کا موقع بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

روایت کے صدف پر تہذیب کے ملنگاف کی روشنی پڑتی ہے تو اُجالا سا دکھائی دیتا ہے۔ رؤف رحیم کی شاعری اسی اُجالے کی شاعری ہے۔ یہ اُجالا اُن کی شاعری پر محیط ہے۔ شاعر حیدرآباد جیسے علم دوست، مہذب اور تصوف اثر شہر کا پروردہ ہے اسی لیے ان کی شاعری کے چہرے پر یہ رنگ ہونا بھی چاہیے انھوں نے اپنے لوزیں جذبات اور خوش رنگ خیالات کو شاعری کی اس زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو صدیوں کی شائستگی کے بعد، ورثہ کے طور پر ہمیں ملی ہے۔

مجھے امید ہے کہ موصوف کا یہ نیا مجموعہ کلام "بساطِ دل" کے مقابلہ میں تمنا کا دوسرا قدم ہوگا۔ میں مسز الزبتھ کورین مونا کا ممنون ہوں کہ مجھے موصوفہ کی وساطت سے رؤف رحیم کی شاعری کو یکجا طور پر پڑھنے کا موقع ملا۔

پروفیسر عنوان چشتی

سربراہ شعبہ ہائے السانیات و لسانیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

ڈاکٹر یوسف سرمست

رؤف رحیم حیدرآباد کے شعری و ادبی حلقوں میں معروف بھی ہیں اور مقبول بھی وہ بہ یک وقت سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں اور مزاحیہ بھی۔ یہ بات خود ان کی شعری صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ ایسے بہت کم شاعر ہوتے ہیں جو سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں یکساں طور اعتبار پیدا کرسکیں۔ یہ رحیم کا کارنامہ ہے کہ وہ آج دونوں حیثیتوں سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ "خُدا خیر کرے" مقبولیت اور پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں اپنے پہلے مجموعے کلام "بساطِ دل" کی وجہ سے وہ معروف ہو چکے ہیں اب ان کا تیسرا مجموعہ "نشاط الم" منظر عام پر آرہا ہے "بساطِ دل" پر "نشاط الم" کی بازی لگانا ان کی شاعرانہ خود اعتمادی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کو شاعری سے فطری اور جذباتی لگاؤ ہے بلکہ ان کو پیدائشی شاعر بھی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ وہ حیدرآباد کے بہت ہی معروف شاعر جناب شمس الدین "تاباں" مرحوم کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ اس سارے شعری پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا نیا شعری مجموعہ "نشاط الم" نہ صرف ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا بلکہ ان کے شعری مقام کو بلند تر بھی بنائے گا۔

"کنعان" بنجارہ ہلز

پروفیسر یوسف سرمست
سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

حضرت سیّد نظیر علی عدیل



کہتے ہیں کہ میر و غالب کے زمانے میں گلی گلی شعر و ادب کا چرچا تھا لیکن ادبی تاریخوں کے فٹ نوٹ میں بھی ان شعراء کی پرچھائیں نہیں دکھائی دیتی جو بہ زعم خود میر و غالب کو آئینہ دکھانے کا خبط رکھتے تھے البتہ ایسے شاعر جنھوں نے میر و غالب کے آئینوں کی جوت سے اپنے نگارخانۂ فکر کے لیے جلا حاصل کی وہ نہ صرف زمانے میں پنپے بلکہ ادبی تاریخوں کے ناموں کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے یہی صورتِ حال آج بھی درپیش ہے اچھی شاعری اور اچھے شاعروں کو برا بھلا کہنے والے ہزاروں نظر آئیں گے لیکن ٹٹولو تو جسما ایک بھی موجود نہیں ملے گا. ہاں وہ شاعر جنھوں نے کلاسیکی شاعری سے ایسی شعاعوں کا اکتساب کیا جو کبھی ماند ہی نہیں پڑتیں بلکہ ہر دور میں جگمگاتی رہتی ہیں اور شعر و ادب کے بیشتر سنجیدہ اور معتبر قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی ایک الگ تاریخ رکھتے ہیں اور آئے دن اس میں اضافے ہی کیے جا رہے ہیں. ایسے ہی معدودے چند شعراء میں رؤف رحیم کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کی معنی خیزی اور فکری اور فنی رجحانات کے سفر کی پہلی منزل پر صدمے جھیلنے کے باوجود اپنی راہ کو ہموار بنا لیا اور اس پر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں.

شاعر اس لیے شعر کہتا ہے کہ وہ شعر کہنے پر مجبور ہے ہر تخلیق فنکار پر اس کے اضطراب، اس کی روحانی کسک، اس کی خود رفتگی اور الجھن کا جبر ہوتا ہے اور یہی جبر اس کو اظہار کی راہ پر لگاتا ہے. اس کے علاوہ عصری مزاج کی نمائندگی کے لیے جس شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ مسلسل مشق، صحیح رہنمائی اور بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے رؤف رحیم نے وہ شعور اس عمر میں حاصل کر لیا جسے حاصل کرنے کے لیے ابھی کچھ اور عمر درکار تھی اس کی بھی چند وجوہ ہیں پہلی تو یہ کہ انھوں نے مرحوم شمس الدین تاباں کے فرزند ہونے کے ناطے شاعری ورثے میں پائی دوسری وجہ ان کا مطالعہ اور مطالعہ سے اکتساب کی صلاحیت ہے تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں ان کی رہنمائی ایسی شخصیتوں نے کی جن سے وہ مطمئن ہو سکتے تھے. اس طرف سے آسودہ ہونے کے بعد وہ شاعری کی نئی جہتوں کی طرف لگ گئے

نتیجے کے طور پر ان کی فکر کا عنصر گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا اور اب ان کی شاعری میٹھے احساس کی زبان ہے جو فکرِ زیریں لہر کی صورت میں کارفرما ہے۔

اس سے قبل رؤف رحیم کے دو شعری مجموعے "بساطِ دل" اور "خدا خیر کرے" شائع ہو چکے ہیں جو علی الترتیب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ حکومت اترپردیش اور اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے جزوی تعاون سے شائع ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ "نشاطِ الم" کی اشاعت میں بھی امکان ہے کہ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جزوی اعانت شامل رہے گی پہلے دونوں مجموعے کافی مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بِک گئے۔ لہٰذا اِس مجموعہ کلام سے بھی ویسی ہی توقعات وابستہ کی جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

مَیں نے اس مضمون میں رؤف رحیم کے کچھ شعر نمونے کے طور پر اس لیے درج نہیں کیے کہ جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اِن کے کافی اشعار دلچسپ وضاحت کے ساتھ نذرِ قارئین کردیئے ہیں۔

مغلپورہ

سیّد نظیر علی عدیلؔ

حمد

ہے جو وظیفہ مرا لا اِلٰہ اِلا اللہ
ہر اک مرض کی دوا لا اِلٰہ اِلا اللہ

صدا جو گونجی تھی پہلی نبیؐ کے کانوں میں
یہی تھی ایک ندا لا اِلٰہ اِلا اللہ

یہی وظیفۂ اعظم ہے سب وظیفوں میں
رہے زباں پہ سدا لا اِلٰہ اِلا اللہ

رہے گی فکر اُسے دین کی نہ دُنیا کی
کہ جس نے دل سے کہا لا اِلٰہ اِلا اللہ

شجر، حجر یہ زمیں آسماں سمندر سب
پُکارتے ہیں سدا لا اِلٰہ اِلا اللہ

ہزار کفر نے کی کوشش مٹانے کی
دلوں سے مِٹ نہ سکا لا اِلٰہ اِلا اللہ

رہے گی موت بھی آسان اس بشر کی رحیمؔ
زباں پہ جس کی رہا لا اِلٰہ اِلا اللہ

مناجات

شمع ایماں کی مرے دل میں جلا دے یارب
دل کی اجڑی ہوئی بستی کو بسا دے یارب

جو مرے پاس ہے کر دوں گا وہ قرباں تجھ پر
لڑکھڑائیں گے نہیں میرے ارادے یارب

روزِ محشر مجھے غیروں میں تو شرمندہ نہ کر
تُو ہے ستّار مرے عیب چھُپا دے یارب

تیرے ہاتھوں کا کھلونا ہے یہ دنیا ساری
تیری مرضی ہے بسا دے کہ مٹا دے یارب

پاک ہو جاؤں گا میں چُوم کے سنگِ اَسوَد
مکّہ جانے کے کچھ اسباب بنا دے یارب

تیرے محبوب کی اُمّت میں ہیں ہم سب شامِل
کیسے ممکن ہے کہ تو ہم کو بھلا دے یارب

یاد میں تیری تڑپتا ہے شب و روز رحیم
کسی صورت سے اُسے جلوہ دِکھا دے یارب

نعتِ اقدسؐ

جب دِل کو ہم نے یادِ نبیؐ سے سجا لیا
ایسا لگا کہ مقصدِ کونین پا لیا

اک چاندنی سی رُوح میں میری اُتر گئی
آنکھوں میں جب سے گنبدِ خضرا بسا لیا

اللہ بھی تو آپؐ کا مُشتاقِ دید تھا
عرشِ بریں پہ اس لیے اُن کو بُلا لیا

وہ آئینہ تھا یا کہ کوئی عکس آئینہ
معراج کا ہے واقعہ اب تک سوالیہ

ثابت ہوا کہ آپ کی تابع ہے کائنات
سورج کو اک اشارے سے واپس بُلا لیا

جس کے اثر سے کوہ بھی ہو جاتے پاش پاش
سرکارؐ نے وہ بارِ نبوت اُٹھا لیا

ہے بخششِ رحیم بھی نسبت سے آپؐ کی
ہے مطمئن کہ آپؐ کے دامن کو پا لیا

نعت ﷺ

جلنے سے عیاں اے دل والو! پروانوں کی اُلفت ہوتی ہے
آجاؤ کہ روشن محفل میں اب شمعِ رسالت ہوتی ہے

سرکارؐ کی سنّت پر چل کر تکمیلِ شریعت ہوتی ہے
اس واسطے اُمت کی اُمت وارفتۂ سنت ہوتی ہے

جب لب پہ وہ نام آجاتا ہے بے چین طبیعت ہوتی ہے
پھر اشک رواں ہو جاتے ہیں آنکھوں کی طہارت ہوتی ہے

جانے کو مدینہ جاتے ہیں سب لوگ زیارت کرنے کو
مر جائیں مدینہ میں جا کر یہ آخری حسرت ہوتی ہے

نادم ہیں گنا ہوں پر عاصی لیکن یہ یقیں بھی رکھتے ہیں
گر اُن کا وسیلہ مل جائے بے شبہ شفاعت ہوتی ہے

کیوں کر نہ بڑے ہوں رُتبے میں اللہ کے سارے نبیوں سے
سرکارِ دو عالم پر حق سے جب ختم نبوت ہوتی ہے

ممکن ہے جہاں تک نعت لکھو بخشش ہے اگر مقصود رحیم
چارہ ہی نہیں کچھ اس کے سوا بس اک یہی صورت ہوتی ہے

سلام

ہم اُن کو یاد بصد احترام کرتے ہیں
حُسین رضؓ ابن علی رضؓ کو سلام کرتے ہیں

شہید مرتے نہیں ہیں کبھی زمانے میں
زمیں پہ رہ کے فلک پر قیام کرتے ہیں

حُسینؓ ان کے نواسے ہیں ان کے لختِ جگر
کہ جن کے حکم سے کنکر کلام کرتے ہیں

وہاں پلائیں گے کوثر کے جام ان کو نبیؐ !
یہاں جو نوش شہادت کے جام کرتے ہیں

یہ ایسا غم ہے کہ دل سے مٹائے مٹ نہ سکے
غمِ حُسین رضؓ تو ہم گام گام کرتے ہیں

ہم ان کی یاد مناتے ہیں اس لیے دل سے
پیام اُن کا جو تھا اس کو عام کرتے ہیں

جہاں بھی سبطِ محمدؐ کا تذکرہ ہو رحیم
وہاں اُتر کے فرشتے قیام کرتے ہیں

منقبتِ غوث پاکؓ

مسلّم اولیاء میں ہے بڑائی غوث آعظم کی
"خُدا ہے غوثِ آعظم کا خُدائی غوث آعظم کی

میں ٹھکرا کر جہاں کی نعمتیں پالوں درِ اقدس
شہنشاہی سے بڑھ کر ہے گدائی غوث آعظم کی

مشرف ہوگئے اسلام سے ڈاکو جو کافر سے
اثر انداز تھی ان پر مسیحائی غوث آعظم کی

محی الدین تھے وہ کر گئے پھر دین کو زندہ
کرامت یہ تو تھی اک ابتدائی غوث آعظم کی

وہ محبوب الٰہی ہیں وہ پیرو کار احمد ہیں
زمانے پہ ہے روشن پارسائی غوث آعظم کی

مہک اُٹھی فضائیں اور ہوئی ہے نور کی بارش
سجیں بھی ہم نے محفل جب سجائی غوثِ آعظم کی

مقام پاک کو سمجھا نہیں ہے تُو رحیم اب تک
نہیں آساں کچھ مدحت سرائی غوث آعظم کی

غزلیں

ایسے آنکھوں سے دُور خواب ہوا
اِک جزیرہ تھا زیرِ آب ہوا

جو بھی اس در پہ باز یاب ہوا
دونوں عالم میں کامیاب ہوا

ٹوٹ کر بن گیا خُدا کا گھر
خانۂ دل کہاں خراب ہوا

اُس سے دُنیا وجود میں آئی
آدمی وجہِ انقلاب ہوا

اِک مکمل نصاب ہے ہستی
اپنا جینا تو ایک باب ہوا

اُن کا نظریں جُھکا کے چُپ ہونا
سَو سوالوں کا اک جواب ہوا

قلب کو جس سے تھا سکون رحیمؔ
اب وہی وجہِ اضطراب ہوا

آج پورا مرا یہ خواب ہوا
اس کی نظروں میں انتخاب ہوا

حُسن جب داخلِ شباب ہوا
نازشِ و رشکِ ماہتاب ہوا

جو مُسلط رہے زمانوں پر ا
اُن کا جینا بھی اب عذاب ہوا

جو سزا چاہے دو کہ مجرم ہوں
جرمِ اُلفت کا ارتکاب ہوا

اک قیامت ہوئی بپا دل میں
دیکھنا کون بے نقاب ہوا

موسمِ ہجر تھا گھٹائیں تھیں
اس لیے مائلِ شراب ہوا

اک کرن پا کے ذاتِ النورؐ کی
میں تو ذرّے سے آفتاب ہوا

عاصیوں پر اُٹھی نگاہِ کرم
سب سزاؤں کا سدِ باب ہوا

اک زمانہ ہوا خلافِ رحیم
جب سے وہ مائلِ عتاب ہوا

طائرِ رُوح نہ ہی جسم کا پنجرا اپنا
ہے کسی اور کے ہاتھوں میں یہ جینا اپنا

اُنگلیوں پر مرے عیبوں کو گِنانے والے
آئینے میں تو ذرا دیکھ لے چہرہ اپنا

یہ علامت ہے کہ سورج ہے تنزل کی طرف
اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایا اپنا

ہارنے والا ہو بدظن تو نہیں جیت اپنی
فتح وہ ہے کہ بنے جس میں پرایا اپنا!

اپنی تقسیم ہے دنیا سے نرالی تقسیم
حق میں اوروں کے اُجالا تو اندھیرا اپنا

فِکر اشعار کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
فہم و دانش سے بہرحال ہے رشتا اپنا

دوسروں سے نہ رکھو تم کوئی اُمید رحیمؔ
آدمی بوجھ اُٹھاتے ہیں خود اپنا اپنا



روح کو یاد کی خوشبو سے معطر رکھنا
بند کوزے میں بہرحال سمندر رکھنا

عشق میں خود کو مٹائیں تو ملے گی منزل
راہِ اُلفت میں قدم سوچ سمجھ کر رکھنا

سب پرندوں کی دُعائیں تمہیں مل جائیں گی
اپنے آنگن میں کوئی پیڑ تناور رکھنا

ان کے احوال سے ہر حال میں رہنا واقف
ربط احباب سے اے دوست برابر رکھنا

یہی احباب کا شیوہ ہے روایت بھی یہی
آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر رکھنا

آنکھ کی راہ سے وہ دل میں چلے آئیں گے
پھول زخموں کے سہی دل کو سجا کر رکھنا

اُن سے کہیئے ہمیں حسرت سے بچانے کو رحیم
منتشر زلفوں کو اپنی سرِ محشر رکھنا

ذکر ہے یہاں اُن کا اور دل وہاں اپنا
ربط ٹوٹنے پایا اُن سے کب کہاں اپنا

کٹ رہا ہے ہر لمحہ بس خیالِ جاناں میں
کیوں کہیں کہ جاتا ہے وقت رائیگاں اپنا

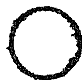
راستے کے پتھر خود راستہ بنا دیں گے
ہو سفر میں ساتھ اپنے عزم گر جواں اپنا

خوں سے جو لکھے تھے خط ہم نے سب جلا ڈالے
دم گھٹا رہا ہے اب اُن کا ہی دھواں اپنا

کشتیاں کنارے تک بس خدا لگاتا ہے
فرض پورا کرتے ہیں موج و بادباں اپنا

جب نہ ہو شجر کوئی سایہ دار راہوں میں
اُن کا فضل رہتا ہے بن کے سائباں اپنا

ہم نے عشق میں سودا کر لیا رحیم ایسا
موسمِ بہار اُس کا موسمِ خزاں اپنا



مُنصف نے اپنے حق میں یہی فیصلہ دیا
مقتول ہو کے ہم نے اُسے خوں بہا دیا

مُردہ دلوں کو جینے کا اِک حوصلہ دیا
اقبالؔ کی خودی نے نیا فلسفہ دیا

ترکِ تعلقات کے اسباب بھول جاؤ
مَیں نے بھی اپنے ذہن سے سب کچھ بُھلا دیا

ہم کو بھی حق پہ لڑنے کی طاقت نصیب ہو
موسیٰؑ کو اپنے فضل سے تو نے عصا دیا

ہم نے بساطِ دل ہی بچھا دی اِسی جگہ
جس جا ترے وجود نے اپنا پتا دیا

سو بار گر کے منزلِ مقصود پا گئی !
تیمور کو بھی چیونٹی نے حوصلہ دیا

دل آئینہ ہے بال نہ آئے کبھی رحیمؔ
یہ سوچ کر ہی وہم کو دل سے مِٹا دیا



جب بھی ہمارے لب پہ ترا نام آ گیا
دل کو سکون رُوح کو آرام آ گیا

ہم سوئے دشت و جانبِ صحرا نکل پڑے
جُوں ہی تمہاری یاد کا پیغام آ گیا

ساقی نے پہلے اوروں کو دے دی شرابِ ناب
حصّہ میں میرے ٹوٹا ہوا جام آ گیا

پلکوں پہ آنسوؤں کے دیئے جگمگا اُٹھے
یادوں کا قافلہ جو سرِ شام آ گیا

پھر عرش و فرش شمس و قمر ڈولنے لگے
محفل سے اُن کی جب دلِ ناکام آ گیا

یہ کیسی چاندنی سی فضا میں بکھر گئی
کیا بے نقاب کوئی سرِ بام آ گیا

جب بھی حریمِ عشق کی راہوں پہ چل پڑے
بس ہم کو یادِ قیس کا انجام آ گیا



آگے دریا ہے کہ صحرا نہیں دیکھا جاتا
عزمِ منزل ہو تو رستا نہیں دیکھا جاتا

آنکھ رکھ کر بھی نظارا نہیں دیکھا جاتا
دل فسردہ ہو تو میلا نہیں دیکھا جاتا

اپنے چہرے پہ کئی چہرے چڑھا رکھے ہیں
مجھ سے خود اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھا جاتا

آنکھ یوں ہو گئی مانوس غمِ جاناں سے
اب کوئی خواب سنہرا نہیں دیکھا جاتا

خود نمائی مری آنکھوں میں بسی ہے ایسے
اب کوئی پھولتا پھلتا نہیں دیکھا جاتا

عشق ہے ایک سفر سجدے میں جانا ہر سو
اس سفر میں کبھی قبلہ نہیں دیکھا جاتا

مختصر طور کی ہے بس یہی روداد رحیم
ہو اگر تیز اُجالا نہیں دیکھا جاتا



کُندن کی طرح شخص وہ نکھرا بھی بہت تھا
بھٹی میں جو حالات کی جُھلسا بھی بہت تھا

ہر حال میں مَیں پا نہ سکا نفس پہ قابو
دشمن تھا مگر جان سے پیارا بھی بہت تھا

پوچھے تو سہی قدر کوئی پانی کی اُن سے
جن تشنہ لبوں کے لیے قطرہ بھی بہت تھا

اونچا بہت اُٹھا تھا گِرا کوہِ انا سے
خود اپنے ہیں ہَیں ٹوٹ کے بکھرا بھی بہت تھا

معتوب زمانہ ہوا، حق بات ہیں کہہ کر
حالات نے سچ کہنے سے روکا بھی بہت تھا

یہ غم ہے کہ اس بھائی کے ہاتھوں ہَیں لُٹا ہوں
سرمایۂ جاں جس پہ لُٹایا بھی بہت تھا

وہ ترکِ تعلق سے پشیماں ہے رحیم اب
ممکن نہیں اُس سے مَیں یہ کہتا بھی بہت تھا



چھپانا آرزوؤں کا اگر آساں نہیں ہوتا
کسی کو بھی تمہاری دید کا ارماں نہیں ہوتا

ہم اپنا دل بچا کر اس ستمگر سے کہاں جائیں
خطا جس کا کوئی بھی ناوکِ مژگاں نہیں ہوتا

جھگڑنے سے مسائل حل نہیں ہوتے زمانے میں
کبھی اک درد سے اک درد کا درماں نہیں ہوتا

ملا ہے جب سے ان کا غم ہمارے قلبِ مضطر کو!
غمِ دوراں ہماری شان کے شایاں نہیں ہوتا

عجب ہے دل کا عالم جس میں غم ہیں سارے عالم کے
کروں میں لاکھ بھی کوشش مگر شاداں نہیں ہوتا

جو ہے بیگانۂ عالم وہ پتھر ہے اُسے اے دل
غمِ جاناں غمِ دوراں غمِ یزداں نہیں ہوتا

میسّر ہے جو قدرت اس کو وہ لوح و قلم سے ہے
رحیم اپنے قلم پر اس لیے نازاں نہیں ہوتا



۲

کسی بھی سانچے میں وہ شخص ڈھل نہ پائے گا
حصارِ ذات سے جب تک نکل نہ پائے گا

مزاجِ وقت کو جو بھی بدل نہ پائے گا
وہ دو قدم بھی کسی راہ پہ چل نہ پائے گا

مَیں اک سمندرِ کربِ بلا ہوں دُنیا میں
"مرے وقار کو دریا نگل نہ پائے گا"

مَیں اپنی جان سے گزر جاؤں گا خوشی پہ تری
تُو میرے ماتھے پہ اے دوست بل نہ پائے گا

دلوں میں تفرقہ لانے کی بات تم نہ کرو
یہ کھوٹا سکّہ زمانے میں چل نہ پائے گا

ہزارِ عیش کے ساماں اُسے میسّر ہوں
ترے بغیر مرا دل بہل نہ پائے گا

رہِ جنوں ہی میں منزل اُسے ملے گی رحیم
کسی کے پیار کا مارا سنبھل نہ پائے گا



دن رات محبّت میں اک کام کیا کرنا
اُن کے ہی تصوّر میں دن رات رہا کرنا

اک آنسو ندامت کا دھو دے گا گناہوں کو
اخلاص ہے اک سجدہ کافی ہے ادا کرنا

دُنیا کی نگاہوں سے ڈر لگتا ہے گر تم کو
اے جانِ تمنّا تم آنکھوں میں بسا کرنا!

کہتے ہیں جسے دُنیا دشمن ہے محبّت کی
اور اس کا یہ شیوہ ہے دو دل کو جُدا کرنا

نفرت کے پرندے سب ہر شاخ سے اُڑ جائیں
کہدو یہ ہواؤں سے اس طرح چلا کرنا

احساس تھکن کا خود قدموں کو پکڑ لے گا
سایے سے شجر کے تم بس دُور رہا کرنا

دشمن بھی رحیم اپنا اللہ کا بندہ ہے
مرنے کی کبھی اس کے ہرگز نہ دُعا کرنا



مری سمت بھی اک نظر دیکھئے گا
پڑا ہوں سرِ رہ گزر دیکھئے گا

تبسّم، تکلّم، ترنّم غضب ہے
کہیں لگ نہ جائے نظر دیکھئے گا

کوئی ناز آخر اُٹھاتا ہے اِتنے!
کبھی دل میں یہ سوچ کر دیکھئے گا

عجب پُرکشش ہے وہ حُسنِ مجسّم
بڑھے تشنگی جس قدر دیکھئے گا

کڑی دھوپ سہہ کر بھی دیتا ہے سایہ
ہے بے لوث کتنا شجر دیکھئے گا

محبّت سے لبریز ہو لمحہ لمحہ
یہ ہے زندگی مختصر دیکھئے گا

رحیم اپنی آنکھوں میں ان کو بسا کر
شب و روز شام و سحر دیکھئے گا



گہرائی میں سوچوں کی اُتر کر نہیں دیکھا
"کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا"

سیماب صفت ہی نہیں ہے برق صفت بھی
اس واسطے میں نے اسے چھو کر نہیں دیکھا

کیا ہو سکے اندازۂ محشر اُسے جس نے
بے مہری احباب کا منظر نہیں دیکھا

انجام گلوں کا انھیں جب سے نظر آیا
حساس نگاہوں نے گلِ تر نہیں دیکھا

آنگن میں محبت کے کڑی دھوپ ہی دیکھی
اُمید کے پودے کو تناور نہیں دیکھا

کیا رشتہ ہے آئینے سے پتھر کا کھلے کیا
جب زاویہ ہم نے ہی بدل کر نہیں دیکھا

کہتے ہیں رحیم آج تجھے شاعر خوش فکر
بت دیکھ لیا لوگوں نے بت گر نہیں دیکھا



جب جب بھی مری آنکھوں میں آنسو نظر آیا
دنیا یہ سمجھ بیٹھی مجھے تُو نظر آیا

فی الواقعی یہ حُسن کا جادو نظر آیا
وہ جلوۂ جاناں مجھے ہر سو نظر آیا

ہر وقت ہی ڈنک اس کی رہی میری انا پر
یہ نفس تو میرا مجھے بچھو نظر آیا

فرقت میں کسی آنکھ سے گرتا ہوا آنسو!
پازیب سے ٹوٹا ہوا گھنگھرو نظر آیا

کیا اس کی نزاکت ہے صباحت ہے نہ پوچھو
وہ چہرہ لٹاتا ہوا خوشبو نظر آیا

ہر ایک برابر ہے گدا ہو کہ شہنشاہ
پس اُس کی نگاہوں میں ترازو نظر آیا

آؤ بھی رحیم آج کے دن عید منائیں
دیکھو رُخِ روشن کا اک ابرو نظر آیا



محبوب کو گر حق نے اُتارا نہیں ہوتا
"اللہ کی قدرت کا نظارا نہیں ہوتا"

ہے عشق کی معراج ڈبو لینا ہی خود کو
"دریائے محبّت میں کنارا نہیں ہوتا"

خود اپنی بنا لیتی ہیں راہیں کئی بیلیں
ہر بیل کو پیڑوں کا سہارا نہیں ہوتا

اعمال لیے جاتے ہیں اس راہ پہ ہم کو
تقدیر کا کوئی بھی ستارا نہیں ہوتا

ہوتی ہے یہی طالبِ عقبیٰ کی نشانی
جُز ذاتِ خدا اس کا سہارا نہیں ہوتا

اشعار مرے اتنے حسیں ہو نہیں پاتے
گر حُسنِ مجسّم کا اِشارا نہیں ہوتا

ہوتا ہے بھروسہ جسے حق پر رحیم اس کو
احسان کسی کا بھی گوارا نہیں ہوتا



کیا سوچ کے ساقی نے پھر جام دیا ہوگا
کیوں دستِ کرم مجھ تک دوبارہ بڑھا ہوگا

احساس نہ ہو غم کا کچھ ایسی دوا دے دے
بے ہوش ہی رہنے دے احسان ترا ہوگا

مَیں اس لیے رہتا ہوں اس ہوش سے بیگانہ
مے خانے سے نکلوں تو ہر زخم ہرا ہوگا

ساقی کی عنایت کا در بند ہوا دیکھو
مے خانے میں رندوں کا اب حال بُرا ہوگا

دل میں جو سکوں ہے اب یہ تیری عنایت ہے
اُلفت کے سمندر میں طوفان تھما ہوگا

ہندو نہ کوئی مسلم جھگڑا نہیں مذہب کا
رندوں کا ہے اِک مذہب کیوں شور بپا ہوگا

وہ آج رحیم اپنی آنکھوں سے پلاتے ہیں
ہر روز کے پینے کا انداز جدا ہوگا





یہ تو میرے واسطے مژدہ ہوا
آج اک چہرہ ملا ہنستا ہوا

مقتلوں کی طرح میرے شہر میں
ہر طرف ہے خون ہی پھیلا ہوا

موت ہے جامد سمندر کی طرح
زندگی دریا ہے اک بہتا ہوا

پا لیا میں نے وفاؤں کا جواب
خط میں اُن کے پھول تھا سوکھا ہوا

یہ جہاں ثابت ہوا مثلِ سراب
ہر قدم پہ اک نیا دھوکہ ہوا

اپنا چہرہ مجھ میں دیکھے کیوں کوئی
آئینہ ہوں ٹوٹ کر بکھرا ہوا

کوئی مجھ پر کیا لکھے گا اے رحیم
میں ہوں اک کاغذ مگر بھیگا ہوا



خط میں حسین یادوں کی زنجیر دیکھنا
اک مشغلہ ہے آپ کی تحریر دیکھنا

نادم ہے مجھ سے ترکِ تعلق پہ وہ حسین
تخریب میں بھی پہلوئے تعمیر دیکھنا

غیروں کی آنکھ کا ہمیں تنکا دکھائی دے
مشکل ہے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنا

گر ہم نہ ہوں تو کون اُٹھائے گا تیرے ناز
ہم سے ہے تیرے نام کی توقیر دیکھنا

مظلوم پر نہ مشقِ ستم کیجیے حضور!
آہوں میں اس کی ہوتی ہے تاثیر دیکھنا

پاکیزگی صفی کی ہی افکار میں نہیں
تاباں کی شعر شعر میں تنویر دیکھنا

ہر شئے میں اس کا حسن نمایاں ہے اے رحیم
کس کس طرح سے کون سی تصویر دیکھنا

○

یہ سزا ہم کو ملی اُمید بر آنے کے بعد
مر رہے ہیں لمحہ لمحہ آپ کے جانے کے بعد

کیا گھٹا، قوسِ قزح کیا، پھر اودھ کی شام کیا
کون دیکھے گا مناظر زُلف لہرانے کے بعد

خط لکھا مجھ کو کسی نے اور وہ بے نام تھا
نامہ بر بھی مُسکرایا خط کو پہچانے کے بعد

تھیں بلائیں جتنی بھی وہ تلملا کر رہ گیئں
آپ کے سایے میں اپنی زندگی لانے کے بعد

روزِ محشر کیا بلا ہے ہے قیامت کیا بلا
اس کا ہم مفہوم سمجھے تم پہ دل آنے کے بعد

ہر کلی اب پھول بننے سے جھجکنے لگ گئی
جان کر انجام کیا ہے گُل کا مُرجھانے کے بعد

ہے شبِ فرقت تو اس کا شکوہ کیوں ہے اے رحیم
صبح عشرت آئے گی اس شب کے ڈھل جانے کے بعد



کرو نہ ذِکر کوئی اور ذِکرِ یار کے بعد
نہیں پسند خزاں، موسمِ بہار کے بعد

بپھر و تو لے کے ہتھیلی پہ اپنی جان بپھرو
میں اس نتیجے پہ پہنچا بڑے وچار کے بعد

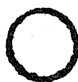
تھی جس کی کاٹ کی جھنکار آسماں میں بھی
بنی نہ پھر کوئی تلوار ذوالفقار کے بعد

تم اپنے آپ کو بے دست و پا ہی کر ڈالو
اگر کھٹکتی ہے مجبوری اختیار کے بعد

ہمارے جسم میں خوشبوئے خسروانہ ہے
ہوئے ہیں گرچہ رعایا اک اقتدار کے بعد

اگر نظر میں نہ رکھیں گے عظمتِ اسلاف
ذلیل و خوار ہی ہو جائیں گے وقار کے بعد

ہوں مطمئن سائیں اس آستاں کو پا کے رحیم
نہیں ہے آگے کوئی راستہ کوئے یار کے بعد



وہ زمیں کا چاند آیا جب مِری دہلیز پر
چاندنی اُتری تھی دِل میں روشنی دہلیز پر

لاکھ خدشے سر اُٹھاتے ہیں ہمارے ذہن میں
جب کھڑا ہو آکے کوئی اجنبی دہلیز پر

بے تکلف ہر بلا آتی ہے گھر میں صحن تک
آکے رُک جاتی ہے لیکن ہر خوشی دہلیز پر

سر بلندی مل گئی ہے بس اُسی دہلیز سے
سر جُھکاتے ہی نہیں ہم اب کسی دہلیز پر

سائلوں میں حسُن کی خیرات آکر بانٹیے
ایک مجمع لگ گیا ہے آپ کی دہلیز پر

بند ہو جاتا ہے دروازہ مری تقدیر کا
جب قدم رکھتا ہوں اپنا میں کسی دہلیز پر

میرے در پر بس یہی تحریر کندہ ہے رحیمؔ
آئیگا بھول کر سب دشمنی دہلیز پر

○

مر مٹیں ہیں ہم جو تیرے نام پر
رشک آتا ہے ہمیں انجام پر

ظلم اتنا اور دلِ ناکام پر
رحم کر کچھ بندۂ بے دام پر

پھر اسی کی آرزو کرتا ہے دل
پھر ہنسی آئی خیالِ خام پر

زندگی ہے موت کا نعم البدل
اور ہم مرتے ہیں اس کے نام پر

سانس جیسے چاپ اُن کے پاؤں کی
مَیں ٹھہر جاتا ہوں ہر ہر گام پر

چاند کا دھوکہ نہ ہو جائے کہیں
زلف بکھرائے نہ آؤ بام پر

امن کی تعلیم دونوں ہی نے دی
کیوں ہیں جھگڑے پھر رحیم اور رام پر



چہرے سے کب عیاں ہے ہمارے لبوں کی پیاس
جیسے سمندروں ہی میں ہے ساحلوں کی پیاس

رُخسار وہ نہیں عرق آلود بے سبب
کوشش میں یاں ہے بجھانے کی شبنم گلوں کی پیاس

قدموں میں رہروؤں کے ہمیشہ پڑے رہے
منزل بجھا نہ پائی کبھی راستوں کی پیاس

بادل سمندروں پہ برس کر چلے گئے
جیسی کی ویسی رہ گئی پھر جنگلوں کی پیاس

صحرا نورد ہو گئے فرطِ جنوں میں ہم !!
خاروں کی پیاس ہے کہ ہے یہ آبلوں کی پیاس

تشنہ لبی ہے ان کا مقدر تو کیا علاج ؟
پی کر بھی اشک بجھ نہ سکی شاعری کی پیاس

کوئی برس کے پیاس بجھاتا ہے سوچیئے
سب سے ہے اے رحیم جدا بادلوں کی پیاس



"مجھ سے پہلے شہر میں تو آئینہ تھا ہی نہیں"
میں ہی میں تھا اور کوئی دوسرا تھا ہی نہیں

کوئی اوّل کوئی آخر دوسرا تھا ہی نہیں
ذہنِ خالق میں یہ سچ ہے آپ سا تھا ہی نہیں

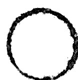
دیدہ و دانستہ میں نے اوڑھ لی ہے تیرگی
میری قسمت میں کوئی جلتا دیا تھا ہی نہیں

بن گیا پتھر کا میں بھی اُن بُتوں کے شہر میں
اس طرف مجھ کو پلٹ کر دیکھنا تھا ہی نہیں

تھا خدا کا فضل خود طوفان ساحل بن گیا
میری کشتی کا نگہباں ناخدا تھا ہی نہیں

بند تھے اپنے انا کے خول میں ہم اس طرح
کھل کے ملنے کا کسی سے راستا تھا ہی نہیں

میں تھا اس میں اور وہ مجھ میں سمایا تھا رحیم
میرے اس کے درمیاں تو فاصلہ تھا ہی نہیں



وہ اب آئیں گے، وہ ابھی آ رہے ہیں
اِسی آس میں ہم جئے جا رہے ہیں

خیالات اُن کے جو تڑپا رہے ہیں
وہ شاید مجھے یاد فرما رہے ہیں

ہے ترکِ تعلق بھی اُلفت کا زینہ
بھُلانے کی خاطر وہ یاد آ رہے ہیں!

وہ آنکھیں وہ زُلفیں وہ رُخسار وہ لب
مری آتشِ غم کو بھڑکا رہے ہیں

بھلا مجھ میں تابِ نظر کیا رہے گی
قیامت کے جلوے نظر آ رہے ہیں

چلے آؤ آنکھوں سے دل میں ہمارے
یہیں آپ تشریف فرما رہے ہیں

رحیم اپنے رُخ سے وہ آنچل اُٹھا کر
تصوّر کی دُنیا کو مہکا رہے ہیں



وفا کی قسمیں وہ کھا کر بھلائے جاتے ہیں
فریب ہنستے ہوئے ہم بھی کھائے جاتے ہیں

کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں
جو زخم دل کو بھی ہنس کر چھپائے جاتے ہیں

بھلائے بیٹھے ہیں ہم کو جو ایک مدت سے
ہم اُن کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں

کبھی خلوص کی شمعیں جلائی جاتی تھیں
ہمارے دیش میں اب گھر جلائے جاتے ہیں

ہمارے خواب ہیں آنکھوں میں منتشر کب سے
بہ شکل اشک وہ مژگاں پہ آئے جاتے ہیں

یہ شاعروں کی بھی فطرت عجیب ہوتی ہے
جہاں کے درد کو دل سے لگائے جاتے ہیں

رحیم اُن کی عنایت ہے زندگی اپنی!
اگرچہ بوجھ ہے پھر بھی اٹھائے جاتے ہیں



جلوے اُسی کے عام ہیں ہر شئے سے ہیں عیاں
کیا کوہِ طور، کیسی زمیں، کیسا آسماں

ہم ہو رہے ہیں آپ ہی اپنے سے بدگماں
کیا جانے کب امان مِلے گی ہمیں کہاں

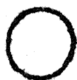
انسانیت، خلوص، وفا، پیار، حُسن و عشق
ان سب سجاوٹوں سے سجا ہے یہ قصرِ جاں

شہ رگ سے بھی قریب جب اس کا وجود ہے
انسان ڈھونڈتا ہے اُسے کیوں یہاں وہاں

فکر و نظر کی کچھ حدِ پرواز ہی نہیں
یہ شاعری تو جیسے ہے اِک بحرِ بے کراں

سانسوں کے ساتھ یادوں کا اک سلسلہ رہے
ورنہ سمجھ لو زیست گئی اپنی رائیگاں

کیوں ہم کو خوفِ گلشنِ عالم میں ہو رحیم
جب برق اس کی اور اسی کا ہے آشیاں



لاکھ بہلاتا ہوں میں دل کو بہلتا ہی نہیں
کیسا موسم ہے کہیں رنگِ تمنا ہی نہیں

کوئی پتھر بھی جو ہوتا تو پگھل جاتا تھا
اُس نے زخموں کو مرے غور سے دیکھا ہی نہیں

آپ کے حُسن کے چرچے تو ہیں ہر سُو لیکن
میرے افسانۂ غم کا کوئی چرچا ہی نہیں

اپنے اشعار میں افکار کی حد ہوتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ آگے کوئی رستا ہی نہیں

میری آنکھوں سے جو دیکھو گے یقیں آئے گا
ان کے جلوے سے حسیں کوئی بھی جلوہ ہی نہیں

ایک سنسان جزیرے میں کھڑا ہوں ایسے
ایک ویرانی ہے اپنی کوئی اپنا ہی نہیں

اے رحیم اس کو رگِ جاں میں بسایا میں نے
یاد پھر کیسے کروں جب کہ میں بھولا ہی نہیں

○

کس طرح اپنے عشق کی اس کو خبر کریں
درپیش معرکہ ہے اسے کیسے سر کریں

ہر گام پہ ہیں حادثے پس منظر یہاں
زادِ سفر ہو ماں کی دُعا تو سفر کریں

پچھتایئے نہ ترکِ تعلق پہ بعد میں
یہ فیصلہ ہے آپ ذرا سوچ کر کریں

سہہ لیں خوشی سے دوست کی اک دین جان کر
ہر غم کو اس طرح سے غمِ معتبر کریں

بسمل بنا کے چارہ گری اب فضول ہے
تاہم جو سعی ہے وہ ذرا تیز تر کریں

پھیلی ہوئی ہے آگ فسادات کی یہاں
ایسے میں رُخ نہ آپ اُدھر بھول کر کریں

خوگر ہیں ہم تو جور و جفا ہی کے اے رحیم
مرضی ہے ان کی خیر کریں یا کہ شر کریں

ہے یہ حسرت کبھی دیکھوں تو میں ایسا دیکھوں
رُوح میں شعر کی تم کو ہی اُترتا دیکھوں

راہ میں تیری نِکل جاؤں تو پھر کیا دیکھوں
کوہ دیکھوں نہ سمندر نہ ہی صحرا دیکھوں

شعر میرے تری مدحت کے سوا کچھ بھی نہیں
چاہتا ہوں کہ ترے نام کو اُونچا دیکھوں

پیرہن میں ہے ترے قوسِ قزح کا منظر
تتلیوں میں بھی ترے رنگ کو بٹتا دیکھوں

ذہن کے سانچے میں پھر ایک غزل ڈھلتی ہے
روبرو تُو ہو اگر تیرا سراپا دیکھوں

ساری دنیا کے نظاروں سے مجھے کیا مطلب
سامنے تُو ہو تو دنیا کو بھلا کیا دیکھوں

جس طرح کوئی سنورتا ہے تصور میں رحیم
کاش ویسے ہی مقدر کو سنورتا دیکھوں

○

جب سے اک چہرہ نیا ہے شہر میں
"ایک ہنگامہ مچا ہے شہر میں"

معجزاتِ زندگی کیسے کہوں؟
زندگی خود معجزہ ہے شہر میں

گاؤں میں پہلی سی وہ خوبی کہاں
گاؤں سارا ہٹ گیا ہے شہر میں

کیوں نہ ہوگی اس کی مٹی بھی عزیز
میرا بچپن گھومتا ہے شہر میں

آئیے جشنِ چراغاں کیجیے
ایک میرا گھر بچا ہے شہر میں

شہر کی گلیوں میں تاریکی کا راج!
کیا یہ سورج سو گیا ہے شہر میں

ڈھونڈتا ہوں اس کو گلیوں میں رحیم
میرا بچپن کھو گیا ہے شہر میں



ان کو احساسِ غم ذرا بھی نہیں
میرے اشکوں پہ تبصرہ بھی نہیں

وہ بلاتے ہوں میں گیا بھی نہیں؟
ایسا اب تک مگر ہوا بھی نہیں

پا رہا ہوں سزا اُس الفت کی
جس میں میری کوئی خطا بھی نہیں

تم جو مل جاؤ سکون آ ئے
یہ مرض کوئی لا دوا بھی نہیں!

شرم سے سُرخ ہو گیا چہرہ!
میں نے ایسا تو کچھ کہا بھی نہیں

کیجیے آپ مجھ پہ مشقِ ستم!
آپ سے مجھ کو کچھ گلہ بھی نہیں

ان کے ہاتھوں میں مہر و ماہ ہیں رحیم
اپنے گھر میں تو اِک دیا بھی نہیں



یہ مانا کہ اس میں فضائل بہت ہیں!
مگر عاشقی میں مسائل بہت ہیں!

مجاز و حقیقت کے فولادی پردے
محبت کی راہوں میں حائل بہت ہیں

ہو مندر کہ مسجد کلیسا کہ گرجا
پہنچنے وہاں تک وسائل بہت ہیں

وہ دستِ جنوں ہو کہ طوقِ خِرد ہو
گلے میں ہمارے حمائل بہت ہیں

وہی بیکلی، برہمی، بد دلی ہے!!
ابھی باقیاتِ اوائل بہت ہیں

نہیں کامراں کوئی یہ بات الگ ہے
وگرنہ محبّت کے قائل بہت ہیں

رحیم ایک فطرت یہ کوئی نہیں ہے
ہے دل ایک لیکن شمائل بہت ہیں



جل جل کے مَیں حالات کی بھٹی میں تپا ہوں
تب جا کے کہیں دوستو کُندن سا بنا ہوں

مت پُوچھنا یہ مجھ سے کہ مَیں کون ہوں کیا ہوں
اس دَورِ جفا کیش میں آوازِ وفا ہوں

کس حال میں جیتا ہوں بتاؤں تمہیں کیسے
حاکم تھا کبھی آج مَیں محکوم ہوا ہوں

سب میری ترقی پہ ہیں انگشت بدنداں
پتھر تھا کبھی آج اک آئینہ بنا ہوں

اندازہ لگاؤ مری ویرانیٔ دل کا!
انسان ہوں سنسان جزیرے میں کھڑا ہوں

اک شمعِ فروزاں کی طرح علم و ادب کی
جلتے ہوئے اوروں کو ضیا بانٹ رہا ہوں

آلامِ زمانہ سے رحیمؔ آج ہوں آزاد
مَیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ چکا ہوں



ہونے والا کم اضطراب کہاں
نیند ہی جب نہیں تو خواب کہاں

نذر کردی تمہیں کو بینائی
اب ان آنکھوں میں آب و تاب کہاں

ہجر کی رُت ہے دل کے آنگن میں
خار اُگتے ہیں اب گلاب کہاں

لوگ کیوں منتظر ہیں محشر کے
زندگی سے بڑا عذاب کہاں

گھونٹ اشکوں کے آج پی لیں گے
"ساقیا آ۔ شرابِ ناب کہاں"

زُلف کے پیچ و تاب کے آگے
زلفِ گیتی کے پیچ و تاب کہاں

اُن کے چہرے کو پڑھ رہا ہوں رحیم
اس سے بہتر کوئی کتاب کہاں



جب نہیں اِن سے بات جاڑوں میں
بے مزہ ہے حیات جاڑوں میں

اک طوالت شبِ فراق میں ہے
ایک لمبی ہے رات جاڑوں میں

جیسے اک پُل صراط کا عالم
وعدۂ التفات جاڑوں میں

کوئی بے گھر غریب سے پوچھے
کیسی گزری ہے رات جاڑوں میں

منتظر ہے لحاف ارماں کی
کپکپاتی حیات جاڑوں میں

جسم و جاں بھی قریب ہوتے ہیں
ہے یہی خاص بات جاڑوں میں

ہے یہ موسم رحیمؔ اُلفت کا
ہے حسیں کائنات جاڑوں میں



ناؤ طوفاں میں ہے ساحل کے حوالے کر دو
جتنے بھی غم ہیں مرے دل کے حوالے کر دو

حالِ صیاد کو گلشن کو سُنانا ہے اگر
میری آواز عنادل کے حوالے کر دو

توڑنا چاہو اگر کُفر کِسی مشکل کا
اپنی آسانی کو مشکل کے حوالے کر دو

راہ گیروں کا یہ پیچھا نہ کبھی چھوڑیں گے
راستوں کو کسی منزل کے حوالے کر دو

ہاتھ اُٹھا ہوا اُٹھا ہی رہے گا اُس کا
اس خزانہ بھی جو سائل کے حوالے کر دو

موجِ طوفاں ہی میں رہنے دو ہماری کشتی
کون کہتا ہے کہ ساحل کے حوالے کر دو

بازیٔ عشق اگر جیتنی ہو تم کو رحیم
اپنے ارمان مقابل کے حوالے کر دو



مَیں ہوں سیماب کی مانند سنبھالو مجھکو
اس سے پہلے کہ بکھر جاؤں اُٹھالو مجھکو

مَیں تو پگھلا ہوا لوہا ہوں، تمہاری مرضی
جو مناسب ہو اسی سانچے میں ڈھالو مجھکو

زندگی، موت میں کیا فرق ہے سمجھاؤ ذرا
اور اُلجھاؤ نہ بے ربط خیالو مجھکو

مجھ سے یہ بارہا کہتا ہے مرا حسّاسِ انا
جسم شیشے کا ہے میرا نہ اُچھالو مجھکو

ارضِ نفرت سے یہ کہنا ہے کہ جینے کیلئے
امن کا بیج ہوں للہ اُگا لو مجھکو

نا خدا ہے کہ سفینہ ہے بھنور یا ساحل
کس کی آواز یہ آتی ہے بچالو مجھکو

غم کو سینے سے لگائے ہوئے پھرتا ہے رحیم
غم کی تاریخ میں بھولو نہ حوالو مجھکو



تجھ پہ سانسوں کی حکومت نہیں دیکھی جاتی
زندگی تیری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی

دوستوں کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے ہم سے
دشمنوں کی بھی مصیبت نہیں دیکھی جاتی

لا نہیں سکتا کھلونا کسی بچے کے لیے
اور اُتری ہوئی صورت نہیں دیکھی جاتی

اپنے معیار سے وہ دستِ عطا بڑھتا ہے
"مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی"

خود فروشی کے عوض نام ہو اونچا اپنا
ایسی صورت کسی صورت نہیں دیکھی جاتی

سب سمجھتے گنہگارِ محبت مجھ کو!
اُن کی معصوم شرارت نہیں دیکھی جاتی

نکتہ چینوں کی یہ مجبوری ہے معلوم رحیم
کم نگاہوں سے حقیقت نہیں دیکھی جاتی



فلسفہ تیمور کو سمجھا گئی اک چیونٹی
"مستقل پیہم مسلسل امتحاں ہے زندگی"

تخلیہ کرنا پڑے گا اب نہیں تو کل سہی
ہے کرایہ کا مکاں کہتے ہیں جس کو زندگی

ان کے جلوؤں سے ہے مثل صبح روشن گھر مرا
اُن کی زُلفوں سے ہے رنگ شام گہرا سرمئی

کر گئی سیراب کھیتوں کو وہ اک ماں کی طرح
اچھی ہے ٹھیرے ہوئے دریا سے اک بہتی ندی

فہم و دانش سے خدا کا جاننا مشکل نہیں
چاہیئے انساں میں پہلے جذبۂ خود آگہی

مصلحت بازی نے خودداری کا سودا کر لیا
ہے انا کا قتل بے شک نفس سے وابستگی

غیر کے ہاتھوں میں نظم میکدہ ہے اب رحیم
جام خالی دیکھ کر بڑھنے لگی ہے تشنگی



"آ گئی یاد شام ڈھلتے ہی"
بڑھ گئی لو چراغ جلتے ہی

دوست سارے بدل گئے یکلخت
میرے حالات کے بدلتے ہی

ایک طوفانِ آرزو اُٹھا
دل میں ارمانوں کے مچلتے ہی

آدمی سانپ بن کے ڈس لے گا
حد سے آگے انا نکلتے ہی

ہم اُجالے بٹور نے نکلے
آس کے اک دیئے کے جلتے ہی

سر کچل دینا چاہیئے اُس کا
دل میں نفرت کا ناگ پلتے ہی

صبح محشر ہوئی طلوع رحیم!
اک قیامت کی رات ڈھلتے ہی

ہمت جو اپنی عزمِ سفر تک نہ آئے گی
منزل قریب کیا ہے نظر تک نہ آئے گی

سورج کی روشنی جو قمر تک نہ آئے گی
پھر چاندنی کسی کے بھی گھر تک نہ آئے گی

تقسیم گھر کو کر دے گا شک اس کمال سے
دیوار درمیاں کی نظر تک نہ آئے گی

میرے مکاں پہ کندہ ہے اے دوست تیرا نام
کیسی بھی ہو بلا مرے گھر تک نہ آئے گی

جب تک صدف کا منہ نہ کھُلے تپتی ریت پر
کوئی چمک دمک بھی گہر تک نہ آئے گی

یہ سوچ کر جلائیے گھر کو پڑوس کے
کیا اس کی آنچ آپ کے گھر تک نہ آئے گی

کیسے وہ سایہ دے گا کسی کو بھی اے رحیم
جب دوپہر کی دھوپ شجر تک نہ آئے گی



نشاط الم

چاند تاروں سے بھی آگے ہے رسائی اپنی
ہم نے منزل ہی بہت دُور بنائی اپنی

ہم سے کترا کے ترقی بھی نہیں کر سکتے
ہاں! ہزاروں میں ہے شامل یہ اکائی اپنی

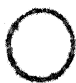
جھوٹ لاکھوں میں بکا کرتی ہے اب بھی لیکن
ہم لیے پھرتے ہیں انمول سچائی اپنی

ہم پہ یہ راز بہر حال ہوا ہے افشا
ہے خدا اپنا تو پھر ساری خدائی اپنی

آنکھیں رکھ کر بھی نہیں دیکھتے ہم دُنیا میں
غیر کی نیک روش اور بُرائی اپنی!

ہم جو دشوار پسندی کے ہوئے ہیں قائل
محفلِ شوق حوادث سے سجائی اپنی

رُوح تو جسم کے زنداں میں مقید ہے رحیم
جیتے جی کس طرح ممکن ہے رہائی اپنی



جدھر دیکھو ہے کاوشِ امتحاں کی
اسے کہتے ہیں گردشِ آسماں کی

اُتر آیا ہے جب سے چاند گھر میں
مرے دل پہ ہے بارشِ کہکشاں کی

پہنچ ہی جائیں گے اس آشیاں تک
اگر سچی ہو خواہش آشیاں کی

کسی کی یاد میں ایسا ہوا گم
سُنائی دی نہ شورش دو جہاں کی

جلائے دل یہاں بھونروں کے گُل نے
اسے کہتے آتشِ گلستاں کی!

وہ طوفانوں سے کیسے بچ سکیں گے
جو کرتے ہیں پرستش بادباں کی

رکھو قابو میں تم اپنی زباں کو!
رحیم اک شر بھی ہے لغزش زباں کی



آئے گی قضا جب بھی کیا اس کے سوا دے گی
مٹی کے کھلونے کو مٹی میں ملا دے گی

ممکن ہو بجھا دینا اُلفت کی گھٹا بن کر
چنگاری یہ نفرت کی اک آگ لگا دے گی

تاثیرِ دوا کہنا، خوش فہمی انساں ہے
ہوگا جو کرم اس کا مٹی بھی شفا دے گی

ہو عزم مصمم تو دشوار نہیں راہیں
منزل کی لگن ہم کو منزل کا پتا دے گی

ہوتی ہے اگر بارش اشکوں کی تو ہونے دو
جو آگ ہے یادوں کی اس کو تو بجھا دے گی

آنے دو ذرا اس میں اسلاف کی خودبینی
انساں کو نئے سر سے انسان بنا دے گی

اچھی ہے رحیم اتنی لازم ہے انا جتنی
بڑھ جائے اگر حد سے پستی میں گرا دے گی

○

کب سے سجا کے رکھا ہے بازارِ زندگی
ملتا نہیں ہے کوئی خریدارِ زندگی

انسان ہے ازل سے گرفتارِ زندگی
وہ جانتا ہے کیسی ہے رفتارِ زندگی

کوزے میں ہم نے جیسے سمندر سمو لیے
اشعار میں سمٹے ہیں افکارِ زندگی

کوئی سمجھ نہ پایا کہ انسان اصل میں
مجبورِ زندگی ہے کہ مختارِ زندگی

ہر غنچہ مری روحِ محبت کا کھل اُٹھا
مہکا ہے لمسِ یار سے گلزارِ زندگی

ہے اپنا حسنِ ظن کہ اُٹھاتے ہیں اس کے ناز
خود کو سمجھ سمجھ کے خطاوارِ زندگی!

بینائی کی نہیں ہے کوئی شرط اے رحیم
ہوتا ہے ہر بصیر کو دیدارِ زندگی

○

کھلتے نہیں کسی پہ جب اسرارِ زندگی
کیسے بتائے کیا ہے وہ معیارِ زندگی

ہم اپنی ذات ہی میں جو محصور ہو گئے
اب تک سمجھ نہیں سکے پندارِ زندگی

تسخیرِ کائنات کا انساں ہے مستحق
اس کے لیے سجا ہے یہ بازارِ زندگی

انسان لاکھ گردشِ حالات میں رہے
ہوتا نہیں کبھی بھی وہ بیزارِ زندگی

ہم نے اُٹھایا بارِ امانت بصد خلوص
ہے جانِ ناتواں پہ یہ کہسارِ زندگی

کیا جانے کس گھڑی وہ مرے سر سے چھین لے
رکھی ہے میرے سر پہ جو دستارِ زندگی

آنکھوں میں اشک اور ہے لب پہ ہنسی رحیم
ہوتے ہیں اس طرح کے بھی آثارِ زندگی

اس سے بڑھ کر کیا قضا لے جائے گی
ہم سے جینے کی ادا لے جائے گی

نفرتوں کے پیڑ کتنے ہی اُگیں!
وقت کی آندھی اُڑا لے جائے گی

دھوپ ڈھل جائے تو پھر سایہ کہاں
دھوپ سایے کو اُٹھا لے جائے گی

زندگی کیا پتھروں کے شہر میں
جسم اپنا سا بچا لے جائے گی

یُوں فضاؤں میں نہ لہراتے پھرو
زُلف کی رنگت گھٹا لے جائے گی

وہ نہیں آئیں گے لیکن اُن کی یاد
مجھ سے مجھ کو ہی چُرا لے جائے گی

میرے پاس آتی نہیں کوئی بلا!
آئے گی بھی وہ تو کیا لے جائے گی

عزم گر زادِ سفر بن جائے گا
منزل آ کے خود بلا لے جائے گی

یاد سے رشتہ رکھو قایم رحیم
عمر بس اس کے حوالے جائے گی

عنایت اُن کی جب بے انتہا تھی
کمی ہی بجز تجھے دنیا میں کیا تھی

وہ ہم کو کر کے رخصت رو پڑے تھے
ہمارے عشق کی یہ انتہا تھی

رہِ غم میں نہ آیا ساتھ کوئی؛
رہا ہے صرف سایہ بن کے ساتھی

اُٹھائے ناز بھی ہنس ہنس کے اُس کے
یہ مانا زندگانی بے وفا تھی

کہاں تک میں نہ تھکتا چلتے چلتے
تمہاری آرزو تو راستہ تھی

مرے احباب کے ہاتھوں سے سے
نوازش پتھروں کی بھی یہ کیا تھی

رحیم اب تک کیا جو ضبطِ غم کو
تقاضائے وفا تھا یا انا تھی!!



آزاد ہو گئے ہیں مگر ہے گھٹن ابھی!
منزل بھی مل گئی تو ہے رُخ پر تھکن ابھی!

اچھا ہی ہے رہیں جو عنادل چمن سے دور
بیٹھے ہوئے ہیں شاخ پہ زاغ و زغن ابھی

ہوتا ہے کامیاب تو دل ہیں یہ رکھے خیال
ہم کو نکھارنا ہے یہاں اپنا فن ابھی!

اپنی زبان دانی پہ ہرگز نہ آئے آنچ
اہلِ زباں ہیں خیر سے اہلِ دکن ابھی

ماں باپ کی دُعاؤں سے ہو جاؤ تم نہال
اس سے بڑا نہیں ہے زمانے میں دھن ابھی

شاید تسلیوں میں کوئی جان ہی نہیں
ماتھے پہ ہے غریب کے باقی شکن ابھی

ہے کائناتِ رُوح معطر مری رحیم
شاید گیا ہے پاس سے وہ گلبدن ابھی



ایسا بھی نہیں مجھ کو تری آس نہیں ہے
تُو ہو کے مرے پاس مرے پاس نہیں ہے

کس طرح مٹاؤں گا ترا نام میں دل سے
یہ دل ہے کوئی صفحۂ قرطاس نہیں ہے

آزاد ہوائیں بھی میسّر نہیں مجھ کو
افسوس کہ ہوں شہر میں بن باس نہیں ہے

ہے دل ہی مرا آج مری جان کا دشمن
لگتا ہے محبت ہی مجھے راس نہیں ہے

ہو آنکھ تو پتھر میں بھی ہیرا نظر آئے
اندھے کو تو الماس بھی الماس نہیں ہے

اس واسطے منزل سے ہیں بیگانہ وہ احباب
اجداد کے اقدار کا اب پاس نہیں ہے

شعروں میں رحیم اپنے نہ ہوں کیوں غمِ دوراں
شاعر ہی نہیں ہے وہ جو حساس نہیں ہے



حُسنِ جاناں بھی کتنا پیارا ہے
کبھی شبنم کبھی شرارا ہے

اِک تری یاد کا سہارا ہے
ورنہ جینا کِسے گوارا ہے

اس پہ جور و ستم روا نہ رکھو
دل ہمارا نہیں تمہارا ہے

ہے سمندر یہ زندگی بے شک
موت اس کا مگر کِنارا ہے

میری نس نس میں آ کے بس جاؤ
میری نس نس پہ حق تمہارا ہے

ہم بھرو سے پہ رہ گئے اس کے
ہم کو تقدیر ہی نے مارا ہے

صبح روشن ہے اس کے رُخ سے حیم
زُلف سے رات کا نظارا ہے



بھگت رہا ہوں جُدائی کی میں سزا کب سے
جلائے بیٹھا ہوں یادوں کا اک دیا کب سے

خلاف کس لیے ہابیل کا ہوا قابیل
دلوں میں آ گیا دونوں کے فاصلہ کب سے

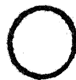
ذرا سی دھوپ سے بچنے کے واسطے ناحق
اُٹھائے بیٹھا ہوں احسان پیڑ کا کب سے

وہ آئیں یا کہ نہ آئیں یہ اُن کی مرضی ہے
مگر ہے بزم میں اُن کا ہی تذکرہ کب سے

یہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہیں کتنی !؟
میں تک رہا ہوں شب و روز راستا کب سے

حصارِ ذات سے باہر نکل نہیں سکتا
اسیرِ زلفِ انا ہے وہ پارسا کب سے

میرے نصیب میں دیدار ہی نہیں ہے رحیم
نہ جانے مجھ سے ہے میرا خُدا خفا کب سے



اپنی خود دار طبیعت کا سہارا ہے مجھے
کب کسی کا کوئی احسان گوارا ہے مجھے

حادثوں نے ہی سنبھالا ہے نکھارا ہے مجھے
موجِ طوفاں بھی سمندر میں کنارا ہے مجھے

کان دھرتا تو یقیناً میں سنبھل سکتا تھا
ہر گزرتے ہوئے لمحے نے پکارا ہے مجھے

اس سے بڑھ کر مرے جینے کی سزا کیا ہوگی
خود مرے دل کی تمناؤں نے مارا ہے مجھے

ہر قدم پہ میں بھٹک جاتا ہوں رک جاتا ہوں
ایسا لگتا ہے کہ تو نے ہی پکارا ہے مجھے

جس نے دیکھا مجھے محرومِ تمنّا سمجھا
نامرادی نے مری اتنا ابھارا ہے مجھے

کر دیا کارِ جہاں بانی مرے ذمّہ رحیم
اس زمیں پر یونہی کب اس نے اتارا ہے مجھے



اگر ہے واسطہ لازم اُسی سے
تمہارے غم کو سہہ لیں گے خوشی سے

مناظر دیکھ کے جلتے گھروں کے
نظر ڈرنے لگی ہے روشنی سے

یہی ہے انقلابِ وقت شاید
ہے خائف آدمی اب آدمی سے

نہیں ہے اعتبارِ زیست ہم کو
بہت دھوکے مِلے ہیں زندگی سے

تھے اب تک مدرسے امن و اماں کے
مساجد ہوں مندر یا کلیسے

نہیں کوئی یہ اندازِ پرستش
بچو تم اے پتنگو خودکشی سے

رحیمؔ اُٹھ کر قیامت رہ گئی ہے
ملے ہم سے وہ بن کر اجنبی سے



اے جذبِ شوق روزنِ در کا پتہ تو دے
دیدارِ دوست کی کوئی صورت دکھا تو دے

خود جل اُٹھے گا شان سے اُلفت کا دیپ بھی
نفرت کی آگ بھڑکی ہے اس کو بجھا تو دے

منزل قریب تر ہے قدم تیز کیجیے
کوئی مسافروں کو یہ مژدہ سنا تو دے

سائل کو اپنے در سے نہ لوٹا دے خالی ہاتھ
ہے تیرے پاس اپنے خدا کا دیا تو دے

اتنی تو کم سے کم رہے انسانیت کی لاج
خوں ریزیوں کی رسم کو رستا اُٹھا تو دے

جگنو کی روشنی بھی نظر آئے گی تجھے
جلتے ہوئے چراغِ مکاں کے بجھا تو دے

کھل جائیں گے رحیم سب اسرارِ بے خودی
حرفِ خودی جو دل پہ ہے اُس کو مٹا تو دے



شمعِ اُلفت کی ہر اک دل میں جلا دی جائے
تیرگیِ ظلمت و نفرت کی مٹا دی جائے

اپنے ہیں ارض و سما بڑھ کے مسخّر کیجے
کہیں ضائع نہ خُدا کی یہ منادی جائے

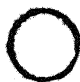
آگ دھیمی ہے مرے دل میں کسی کے غم کی
اس کو محبوب کے دامن کی ہوا دی جائے

جو جُدا بھائی کو اک بھائی سے کر دیتی ہے
ایسی دیوار ہو آنگن میں تو ڈھا دی جائے

خاک ہو جائیں نہ سب جل کے دھماکوں میں کہیں
ایسی نفرت کی نہ بارود بچھا دی جائے

ہے جو تہذیب ہماری وہ ہے گنگا جمنی
یوں نہ جمنا میں وہ نفرت سے بہا دی جائے

اپنے اسلاف سے سیکھا ہے یہی ہم نے رحیم
اپنے دشمن کو بھی جینے کی دُعا دی جائے



گھنی شاخ برگد کی جب سے کٹی ہے
پرندوں کی دُنیا میں اک کھلبلی ہے

ہماری طبیعت میں جو برہمی ہے
یہ بے حس زمانے سے ہم کو ملی ہے

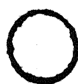
مآلِ محبت ہیں یہ دل یہ آنکھیں
اِدھر تیرگی ہے اُدھر روشنی ہے

ہے عالم میں اب تو قیامت کا عالم
جدھر دیکھیے بے حسی بے حسی ہے

نوازش کرم شکریہ مہربانی
متاعِ غمِ دل عطا تم نے کی ہے

کیا باغباں نے یہ گلشن کا عالم
نہ پھولوں میں خوشبو نہ کچھ تازگی ہے

رحیم اپنے اشکوں کو پیتے ہی رہیے
مئے ارغوانی سے یہ مئے بھلی ہے



ہے پیشِ سفر دشت کا ہیں پاؤں میں چھالے
لیکن نہ رکیں گے کہیں رستے میں جیالے

ایسا نہ ہو عفریتِ زمانہ کہیں کھالے
جانا ہے بہت دور تجھے ماں کی دُعا لے

یہ رنج و الم، آہ و بکا، اشک یہ نالے
سب اس کی امانت ہیں رکھو اس کو سنبھالے

ممکن ہے کہ چھٹ جائے شبِ غم کا اندھیرا
پلکوں پہ تو اشکوں کے ستاروں کو سجالے

یہ عشق کی سوغات عنایت ہے اُسی کی
رکھا ہے بڑے ناز سے جس درد کو پالے

اک فاختہ ہے امن کی اُڑتی ہوئی لیکن
لاکھوں ہیں شکاری یہاں بندوق سنبھالے

ہے راہ کا پتھر تو رحیمؔ اپنی انا خود
ممکن ہو اگر راہ سے پتھر کو ہٹالے



دُنیا یہ ہوئی جاتی ہے شعلوں کے حوالے
یارب یہ تری خاص ہے تخلیق بچا لے

یہ جنگ و جدل خون خرابہ یہ تباہی
ہر سمت فسادی کے ہیں انداز نرالے

اک جنگ کے جنگل کو بسانا نہیں بہتر
ممکن ہو تو اک امن کا پودا ہی اُگا لے

بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھی ہے یہ دُنیا
چنگاری جو ل جائے پڑیں جان کے لالے

ہے زد میں نشانوں کی کلیسا ہو کہ کعبہ
یارَب یہ ترے گھر ہیں انھیں تو ہی بچا لے

ڈس لیں گے کسی روز خبر تک نہیں ہوگی
سانپوں کو کوئی دیدہ و دانستہ نہ پالے

ہر سمت ہیں نفرت کے رحیمؔ آج اندھیرے
مَیں بانٹنے نِکلا ہوں محبت کے اُجالے



آ گئے خواب میں زُلف پیچاں لیے ہم بہت دیر تک دیکھتے رہ گئے
جیسے ساکن سمندر میں کنکر گرا دُور تک دائرے دائرے رہ گئے

مسجدیں ٹوٹ کر مندریں ٹوٹ کر اینٹ پتھر سے بن جائینگے پھر مگر
اُن دلوں کا بتاؤ کہ کیا حال ہو؟ جو فسادوں میں ٹوٹے ہوئے رہ گئے

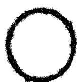
گھر کے بازو تو گھر تھا سگے بھائی کا ذہن اس کی طرف تو نہیں جا سکا
گھر ہمارا جلا تو جلا کس طرح ہم اسی بات کو سوچتے رہ گئے

ریت کے ہم گھروندے بناتے رہے اور انھیں سیپیوں سے سجاتے رہے
لہر آئی بہا کر انھیں لے گئی اور ساحل پہ ہم تاکتے رہ گئے

ایک طوطے پہ ہم نے بھروسہ کیا، اپنے اپنے مقدر کا سودا کیا
کہہ دیا جانے کیا رد پیے کے لیے اپنے دل میں فقط وسوسے رہ گئے

گیسوئے گیتی سُلجھے نہیں آج تک جبکہ بدلے گئے تاج اور راج تک
جس طرف بھی نگاہیں اُٹھیں اس طرف مسئلے مسئلے مسئلے رہ گئے

زندگی اک دہکتی ہوئی آگ ہے زندگی حُسن ہے زندگی راگ ہے
زندگی اے رحیم اک معمہ ہے کیا؟ بوجھیائے نہ ہم بوجھتے رہ گئے



میرے احساس کا افکار کا محور تُو ہے
مَیں تو مظہر ہوں ترا اک مرے اندر تُو ہے

جب ذرا غور سے دیکھا تو یہ محسوس ہوا
چاہے منظر ہو کوئی دِس پسِ منظر تُو ہے

اِتنا خوش رنگ ہے نازک ہے حسیں ہے پیکر
ایسا لگتا ہے کہ تتلی کے پروں پر تُو ہے

مَیں کروں تیری بڑائی کا احاطہ کیسے
میرے اندازہ افکار سے بڑھ کر تُو ہے

دیکھ کر مجھ کو یہ کہتے ہیں سبھی اہلِ نظر
خوگرِ صبر ہے، اخلاص کا پیکر تُو ہے

کوئی پتھر ہو اُسے حُسن کا پیکر کر دے
ہاتھ میں شیشہ ہے اور وقت کا آذر تُو ہے

فتح انسان کا دل کر لے جو ممکن ہو حسیمؔ
ہے قلم ہاتھ میں تلوار، سکندر تُو ہے



ہاتھ میں بندوق لے کر جب اُڑا دینے لگے
سارے پیڑوں کے پرندے بد دُعا دینے لگے

سب مہاجر اپنے اپنے گھر سے یوں رخصت ہوئے
بکھرے پتے جیسے پت جھڑ کا پتہ دینے لگے

فکر کی شمعیں جلائیں ہم نے بزمِ جہل میں
ہاتھ میں اندھے کے جیسے آئینہ دینے لگے

یوں دھماکے ہو گئے معمول اپنے ملک میں
اب پٹاخے بھی ہمارا دل ہلا دینے لگے

قتل بھی ہم ہی ہوئے قاتل بھی ٹھہرائے گئے
مجرمانِ وقت ہی ہم کو سزا دینے لگے

اِک جھلک میں ہوش کوئی چھین کر چلتا بنا
دیدہ و دل دیر تک اس کو صدا دینے لگے

زندگانی بھر کی پونجی لوٹ لی جس نے رحیم
ہم اسی کو زندگانی کی دُعا دینے لگے



یہ تیرا فیض مسلسل خدائے برتر ہے
ہمارے سینے میں جو ایک قلب مضطر ہے

بتاؤ نیند اب آئے تو کس طرح آئے
بدن کے نیچے تو اِک گوکھرو کا بستر ہے

میں سانس لیتے ہوئے بھی جھجکتا رہتا ہوں
فضائے ملک ہی کچھ اس طرح مکدر ہے

جدا ہو کیسے صفت شر کی آج انساں سے
بشر کے لفظ میں پوشیدہ دوستو شر ہے

ہے نفسی نفسی یہاں عام حشر کی مانند
ہر ایک روز یہاں جیسے روزِ محشر ہے

امید، آس، الم، آرزو، تمنائیں
ہمارے دل میں کمی کیا ہے سب میسر ہے

رحیم کیسے جہاں میں سکون ہو حاصل
ہمارے ذہن میں سوچوں کا ایک دفتر ہے

زندگی ہے حرف اس پروار نے
کر دیا بے خود نگاہِ یار نے

کام جو کچھ بھی کیا تلوار نے
اس سے بڑھ کر کر دیا کردار نے

تابِ نظارہ نہیں ہے آنکھ میں
کہدیا ہر طالبِ دیدار نے

جو ملے رنج و الم سنسار میں
مُسکرا کر سہہ لیے فنکار نے

عشق کا حاصل فروغِ بے خودی
یہ بتایا ہے صلیب و دار نے

مسخ قدریں زندگی کی ہو گیئں
رکھ دیا ہے روند کر سنسار نے

کر دیا مسحور مجھ کو اے حسیم
"یار کے پازیب کی جھنکار نے"

خدا کرے دلِ بےتاب کو قرار آئے
خزاں کے دور میں اک بار پھر بہار آئے

تمہارے در پہ جو اک لمحہ ہم گزار آئے
تو ہم کو ایسا لگا زندگی سنوار آئے

خود اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل تھا
ہم اپنے چہرے سے جب بھی نقاب اتار آئے

تمہارے شہر میں لٹتے رہے ہیں ہم پھر بھی
نہ جانے کیسی کشش تھی کہ بار بار آئے

تمہارے در پہ بہائے ہیں دیر تک آنسو
ہمارے ذہن پہ اک بوجھ تھا اتار آئے

ملی ہے عشق کی سوغات اپنے دامن کو
تمہاری بزم سے جب آئے اشک بار آئے

ہماری داستاں غم ناک اس قدر ہے رحیم
"اگر کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے"



حالات ہمیں چین سے سونے نہیں دیں گے
سو پائیں بھی تو سپنے سلونے نہیں دیں گے

یہ دورِ دھماکو ہے اسی واسطے اے دوست!
ہم بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے نہیں دیں گے

یہ زہر زمیں پر تو کسی طرح نہ پھیلے
ہم بیج تعصب کے تو بونے نہیں دیں گے

موتی کی طرح رکھیں گے اشکوں کو چھپا کر
ہم اپنے بھرم کو کبھی کھونے نہیں دیں گے

مظلوم کو بزدل ہی کہا کرتے ہیں لیکن
ظالم سے مگر ظُلم کو ہونے نہیں دیں گے

ہم جانتے ہیں کس کی بدولت ہے تباہی
کچھ لوگ ہیں جو امن ہی ہونے نہیں دیں گے

شہرت نہ چلی جائے غریبی کی رحیم اب
بچوں کو تو ہم چیخنے رونے نہیں دیں گے



کیسا انصاف ہے مقتول ہی قاتل ٹھہرے
اور قاتل جو ہے سفاک وہ عادل ٹھہرے

قابلِ قدر ہمارا ہے یہ عزم محکم!
اپنی دہلیز پہ رہتے ہیں مسائل ٹھہرے

منزلیں تکتی رہیں اپنے ہی قدموں کے نشاں
کب کہاں اہلِ جنوں طالبِ منزل ٹھہرے

کتنے معصوم ہوئے غرقِ بھنور میں لیکن
دیکھتے رہ گئے خاموش یہ ساحل ٹھہرے

تھا نظر سوز ترے حسن کا جلوہ ایسا
غیر ممکن تھا کوئی تیرے مقابل ٹھہرے

اپنی غربت کو چھپاؤ کہ یہی بہتر ہے
ٹھیک لگتا نہیں دروازہ پہ سائل ٹھہرے

سازشیں میری تباہی کی جو کرتے ہیں رحیم!
ہاں! وہی حلقۂ احباب میں شامل ٹھہرے



دل کے صحرا سے کسی کی یہ صدا آئی ہے
یہ جو دُنیا ہے محبت کی تماشائی ہے

اک مرے دل میں ہیں آلام زمانے بھر کے
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

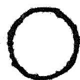
رفعتِ حُسن کا معیار ہے گر حُسن ترا
عِشق میں میرے سمندر کی سی گہرائی ہے

اب غمِ عِشق کی دولت سے نواز اے مالک!
غمِ دوراں سے تو برسوں کی شناسائی ہے

کچھ تعلق بھری برسات سے ہوگا ورنہ
ایسے موسم میں تری آنکھ کیوں بھر آئی ہے

میری تنہائی سے واقف نہیں شاید کوئی
ورنہ کیوں اتنا اُسے دعویٰ یکتائی ہے

نازشِ لوح و قلم ہم تو نہ بن پائے رحیم
ہاں مگر دوست کو تحریر پسند آئی ہے



کچھ کے ایسے لگاتا ہے یارِ غار مجھے
کہ اپنے آپ سے ممکن نہیں فرار مجھے

سمجھ رہی تھی یہ دنیا ذلیل و خوار مجھے
تمہاری چاہ نے رکھا ہے ذی وقار مجھے

چلا گیا ہے کوئی کر کے اشکبار مجھے
نہ جانے کیوں ہے اسی کا پھر انتظار مجھے

اُمید و بیم میں کیوں در بدر بھٹکتے ہو
وہ کہہ رہا ہے کہ "بندے ذرا پُکار مجھے"

گلہ ہے دوست سے کوئی نہ شکوہ دشمن سے
کہ لے کے ڈوبا ہے خود میرا اعتبار مجھے

کہیں میں گیسوئے آلام میں نہ پھنس جاؤں
نہ چھوڑ اکیلا کسی وقت زُلفِ یار مجھے

ضمیر نام اسے دوں تو کیا غلط ہے رحیم
وہ جو جھنجھوڑتا رہتا ہے بار بار مجھے



کوئی سمجھائے لبوں پر کیوں ہنسی متروک ہے
رسم ہے دنیا کی یا میری خوشی متروک ہے

دار پر منصورؔ مجنوں دشت میں، ہم دربدر
ہر زمانے ہی میں گویا عاشقی متروک ہے

ان کے ہونٹوں کا تبسم قتل کرتا ہے کرے
ہاں مگر ہونٹوں پہ اپنے آہ بھی متروک ہے

صبح سے ہے شام تک رنج و الم کا سلسلہ
میرے دل کے حق میں شاید ہر خوشی متروک ہے

پیاس سے ہم نے بجھائی تشنگی کی تشنگی
اب ہمارے واسطے تشنہ لبی متروک ہے

دن خیالوں میں کٹا تو رات آنکھوں میں کٹی
کیا ہماری زندگی کی زندگی متروک ہے

کیوں نہیں رکھتے اسی کا نام وہ فہرست میں
کیا نسیمؔ خستہ جاں کا نام ہی متروک ہے



سلگتے ہوئے تھے آپ کی یادوں کے دو دیئے
ہم ان کو ڈھال کے اشکوں میں رو دیئے

تارِ نظر میں آپ نے آنسو پرو دیئے
ہونٹوں نے مسکرانے کے انداز کھو دیئے

اے دوست تیرے عشق کی سوغات جان کر
محفوظ دل میں کر لیے غم تو نے جو دیئے

بھر دیں خوشی سے یا غم و آلام سے اسے
عرصہ ہوا ہے کاسۂ دل آپ کو دیئے

شبنم نہیں ہے اشک ہیں یہ آسمان کے
چہرے جنہوں نے شب میں گلوں کے بھگو دیئے

باقی رہا نہ کچھ بھی تصور سے واسطے
آنکھوں میں جلتے خواب تھے اشکوں نے دھو دیئے

دے کر غمِ جدائی مرے دوست نے رحیم
دل کی زمیں میں جلتے ہوئے خار بو دیئے



صلیب و دار سے رشتا ہے کیا کیا جائے
انا کا پشتنی سودا ہے کیا کیا جائے

فسانہ دیش کا قرطاس پہ میں کیسے لکھوں؟
قلم سے خون ٹپکتا ہے کیا کیا جائے

ہر اک نفس میں ہے موجود نفسِ امارہ
وہ اپنی ذات کا حصّہ ہے کیا کیا جائے

میں جلتے ہوئے قاتل کو ہوں جو مہر بلب
اسی سے خون کا رشتا ہے کیا کیا جائے

نزاعِ دیر و حرم ختم کس طرح ہو گا
دلوں میں تفرقہ بیٹھا ہے کیا کیا جائے

تمہارا نام میں بھولوں تو کس طرح بھولوں
یہی تو میرا وظیفہ ہے کیا کیا جائے

کسی بھی طرح سے کرنا ہے پار اس کو رحیم
اگرچہ آگ کا دریا ہے کیا کیا جائے



اس کے ہاتھوں میں بھی دیکھے کئی پتھر میں نے
جس کو سمجھا تھا اک اخلاص کا پیکر میں نے

اپنے بازو پہ بھروسہ کیا اکثر میں نے
ان لکیروں میں نہیں ڈھونڈھا مقدر میں نے

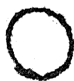
کیسے اغیار کے عیبوں پہ نظر اُٹھ سکتی
جب کہ دیکھا نہیں خود کو ہی برابر میں نے

مجھ کو ہر راہ میں چلنے کا سلیقہ آیا!
جب سے کھائی ہے رہِ عشق میں ٹھوکر میں نے

لوگ مافوق سمجھنے لگے خود سے مجھ کو
اپنے آلام سہے اس طرح ہنس کر میں نے

آئینہ ہو کہ وہ بُت ہو کہ کوئی ہیرا ہو
کبھی رہنے دیا پتھر کو نہ پتھر میں نے

کہیں ڈس لے نہ مجھی کو وہ کسی روز رحیم
نفس کی شکل میں پالا ہے جو اجگر میں نے



رہبر کی رہنما کی ضرورت ہے کیا مجھے
جب مل گیا نصیب سے وہ نقشِ پا مجھے

اچھا ملا ہے اُن سے وفا کا صِلہ مجھے
دُنیا پکارتی ہے شہیدِ وَفا مجھے

حلیہ بنائے پھرتا ہوں میں پارساؤں کا
دُنیا سمجھ رہی ہے بہت پارسا مجھے

دَنگے فساد دیش میں معمول بن گئے
اب قتل و خوں بھی لگتا ہے اک حادثہ مجھے

اس بار خاک ہو گئے بستی کے سارے گھر
مِلتا نہیں ہے اپنے بھی گھر کا پتہ مجھے

مَیں راہِ حق پہ چلنے کا عازم ہوں دوستو
ممکن نہیں کسی سے بھی اب روکنا مجھے

مَیں اپنی خول و ذات میں ہوں بند اے رحیمؔ
باہر نکلنے دیتی نہیں ہے اَنا مجھے!



غمِ جاناں سے گزرا ہے کبھی آلامِ دوراں سے
ملا اس کے سوا کیا آدمی کو بزمِ امکاں سے

کرو اس کی اطاعت تم سے جتنی ہو سکے ممکن
دو عالم میں کوئی ہستی نہیں ہے محترم ماں سے

مرے اشعار میں کیوں کر نہ ہوں گی فکر کی شمعیں
کیا ہے اکتساب فیض میں نے شمس تاباں سے

مجھے ساحل پہ پہنچایا ہے خود امواجِ طوفاں نے
تمہارا نام لے کر جب بھی ٹکرایا ہوں طوفاں سے

ہماری فکر کا شعر و ادب سے ایسا رشتہ ہے
تعلق جس طرح قائم ہے اپنے جسم کا جاں سے

ضرورت کے مطابق مجھ کو مل جائے تو کافی ہے
غرض ہے تخت و مسند سے نہ طاؤسِ سلیماں سے

مٹی جاتی ہیں شاید اے رحیم اسلاف کی قدریں
نہیں تو کیوں پھر انساں آجکل خائف ہے انساں سے



"ہجوم آرزو میں اک مقام ایسا بھی آتا ہے"
جہاں ملنے گلستاں ہی نہیں صحرا بھی آتا ہے

وفورِ عشق میں انسان آپے میں نہیں رہتا
ہنسی آتی ہے خود پر اور کبھی رونا بھی آتا ہے

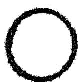
اُمیدوں آرزوؤں کو لگا لاتا ہے ساتھ اپنے
خیالِ یار اے ہمدم کبھی تنہا بھی آتا ہے؟

شبِ ظلمت میں تنہائی بھی ہم کو کاٹ کھائے گی
اُجالا ہو تو اس کے ساتھ ہی سایا بھی آتا ہے

ہے سوزِ حسن کا پیکر جسے ہم شمع کہتے ہیں
جلانا ہی نہیں آتا اُسے جلنا بھی آتا ہے

ہم اپنی جاں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں دُنیا میں
رہِ حق میں ہمیں مرنا نہیں جینا بھی آتا ہے

رہِ منزل میں بڑھتا ہے رحیم اک شیوۂ مرداں
وگرنہ لوٹ کے گھر کو تو اک اندھا بھی آتا ہے



تینوں موسم سے جُدا اک موسمِ خونریز ہے
اس کا خالق جو بھی ہو وہ آج کا چنگیز ہے

کٹ رہے ہیں سر یہاں فصلوں کی مانند آجکل
ہاں! ہمارے دیش کی دھرتی بڑی زرخیز ہے

یہ ستی کی رسم کتنے گھر جلائے کیا پتہ؟
ہے چتا کی آگ روشن اور ہوا بھی تیز ہے

ناوکِ مژگاں سے زخمی ہو گئے ہیں قلب و جاں
آج سینے میں ہمارے درد دلآویز ہے

اشک ٹپکے گا تو ممکن ہے چھلک جائے گا یہ
میرے آگے جو رکھا ہے جامِ غم لبریز ہے

دیکھنا ہے آگے آگے کیا قیامت ڈھائے گی
یہ عروسِ شاعری میری ابھی نوخیز ہے

ہے بڑے اوصاف کا کہتے ہیں جس کو سب رحیم
کم سخن کم فہم کم گو اور کم آمیز ہے



غزل دو قافیوں میں

کہتا ہے بھلا کون کہ مخدوم ہوا ہے
انسان جب انسان کا محکوم رہا ہے

اس طرح خزاں نے اُسے معدوم کیا ہے
اب پھول کی خوشبو سے بھی محروم صبا ہے

موسم کا تقاضہ ہے تکلف نہیں جائز
اے رند! اُٹھا جام ذرا جھوم گھٹا ہے

چلنا ہو تو ہر راہ کے پتھر کو ہٹا دو
جینے کا ہنر آج یہ معلوم ہوا ہے

مشکوک ہے حلیے ہی سے ہر اک کی نظر میں
وہ شخص جو بستی میں نیا گھوم رہا ہے

پروانے کی یہ راکھ ہے اس بات کی شاہد
وہ جلتی ہوئی شمع کے اب چوم چکا ہے

معصوموں کی آہوں کا اثر کیا ہو رحیم اور
ہر سمت مرے دیش کی مغموم فضا ہے



غزل دو قافیوں میں

چھپائے رکھنے ہی میں آبروئے قاتل ہے
ہمارا نفس ہی ہے جو عدوئے کامل ہے

عجیب منظرِ مقتل بہ روئے محفل ہے
کہ اُن کی تیغِ ستم بر گلوئے بسمل ہے

اٹوٹ رشتہ ہے یوں مجھ سے میرے قاتل کا
کہ بعدِ قتل بھی آنکھوں میں روئے قاتل ہے

لکھّا ہے ظُلم ہی مظلوم کے مُقدر میں
ستم پھر اس پہ کہ مسدود کوئے عادل ہے

عجیب مصلحت اندیش ہو گئی دُنیا!
کہ آج حق بھی یہاں دو بدوئے باطل ہے

ہر ایک کو نہیں ملتی نگاہِ لُطف و کرم
پہنچ سکے جو وہاں سرخروئے محفل ہے

چلو کہ سر کو کٹا دیں گے راہِ حق میں حسیمؔ
یہ سچ ہے جامِ شہادت سبوئے واصل ہے

یہ زندگی کٹھن ہے بہت پُل صراط سے
ہر اک قدم اُٹھانا بڑی احتیاط سے

ہم تو محیط ہیں وہ بسیط البساط ہے
باہر اسی لیے ہے وہ اپنی بساط سے

خوشیوں کے ازدیاد میں پوشیدہ غم بھی ہے
مر بھی گئے ہیں لوگ وفورِ نشاط سے

ہر ذرّہ کیوں نہ اپنی جگہ آفتاب ہو
ہمت وہ ہارتا ہی نہیں انحطاط سے

بھوکے کو ایک لقمہ بھی نعمت ہے کم نہیں
آنکھوں سے اشک برسیں گے پھر انبساط سے

روح و بدن میں کوئی تناسب نہیں مگر
انساں بنا ہے ان کے ہم اختلاط سے

حصے میں اس کے کیوں نہیں آئی خوشی رحیم
باہر تھا کیا وہ مانگنے والا سماط سے

دُشوار تری راہ گزر ہے کہ نہیں ہے
چہرے پہ مرے گردِ سفر ہے کہ نہیں ہے

ظُلمات کے پردے میں سحر ہے کہ نہیں ہے
اِس دَور میں ہر عیب ہُنر ہے کہ نہیں ہے

تپتے ہوئے صحرا میں ہے جو ایک نمی سی
اعجاز ترا دیدۂ تر ہے کہ نہیں ہے!

دنیا کے حوادث سے گزر جاتا ہوں محفوظ
یہ ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ نہیں ہے

ہیں خون کے دریا تو کہیں آگ کا جنگل
ہر گام پہ اب خوف و خطر ہے کہ نہیں ہے

محتاج ترے ایک تبسّم کا ہے گُلشن
کلیوں کا تو منظورِ نظر ہے کہ نہیں ہے

رہتی ہے رحیم اس کی خبر مجھ کو تو ہر دَم
اس کو بھی مری کوئی خبر ہے کہ نہیں ہے



زلفِ تقدیر کو اس طرح سنوارا جائے
شدتِ غم میں بھی ہنس ہنس کے گزارا جائے

اُن کی اوقات ذرا دیکھ سکیں گے ہم لوگ
چاند سورج کو بھی دھرتی پہ اُتارا جائے

تیری صورت کو بھلاؤں تو بھلاؤں کیسے؟
غیر ممکن ہے کہ نظروں سے نظارہ جائے

اپنی غیرت کو گوارہ نہ ہوا اب تک بھی
روبرو اوروں کے دامن کو پسارا جائے

گھاؤ الفاظ کے بھی گہرے ہوا کرتے ہیں
کیا ضروری ہے کہ تلوار سے مارا جائے

آرزو دل کی یہی اور زباں کی بھی یہی !
نام ہر وقت اسی کا ہی پکارا جائے

ہم بھی جاتے ہیں رحیم اُن کے اشاروں پہ وہیں
جس جگہ اپنے مقدر کا ستارا جائے



جیت ممکن ہی نہیں پھر بھی لڑا کرتی ہے
زندگی موت سے کب دب کے رہا کرتی ہے

آندھیاں لاکھ بھی نفرت کی بجھانے آئیں
شمع اُلفت تو بہر حال جلا کرتی ہے

خون کے اشک رُلاتا ہے ہمیں عشق ہنوز
قرض ہے دل کا مگر آنکھ ادا کرتی ہے

پیرہن اوڑھ کے الفاظ کا جذبات کیساتھ
فکر اشعار کے سانچے میں ڈھلا کرتی ہے

کسی صحرا میں کھڑے پیڑ کی مانند یہاں
زندگی رنج و الم ہنس کے سہا کرتی ہے

زندگانی میں مفر رنج سے ممکن ہی نہیں
ہر خوشی رنج کا عنوان ہوا کرتی ہے

موج ٹکراتی ہے سراب بھی کناروں سے رحیم
تشنہ کاموں کا جو ہے قرض ادا کرتی ہے



تعارف

نام : محمد رؤف رحیم الدین قلمی نام : رؤف رحیم

ولدیت : محمد شمس الدین تاباں مرحوم

تاریخ پیدائش : ۱۰ جون ۱۹۵۴ء مقام پیدائش : حیدرآباد

تعلیم : بی ایس سی، ایم اے (اردو) عثمانیہ

ملازمت : محکمہ بلدیہ حیدرآباد (سکندرآباد ڈویژن)

مصروفیات : ۱. معتمد عمومی ادبستان دکن (رجسٹرڈ) بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی

۲. معتمد عمومی بزم حکمت سخن ۳. معتمد عمومی پاسبان ادب

۴. معتمد عمومی بزم جمیل ۵. شریک معتمد بزم قادریہ جھیلگوڑہ

۶. معتمد عمومی بزم تاباں ۷. نائب معتمد زندہ دلان حیدرآباد

۸. نائب صدر مینار ادب

★ مصنف کی دیگر کتابیں :-

۱. زنجیر و زنار کلام شمس الدین تاباں

۲. بساطِ دل سنجیدہ کلام شعری مجموعہ بہ تعاون فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ یوپی ۱۹۸۷ء میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام سے نوازا۔

۳. گلزار صفی ۱۹۸۷ء کلام صفی اورنگ آبادی

۴. خدا خیر کرے مزاحیہ کلام ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا جسے اردو اکیڈیمی نے انعام سے نوازا

۵. نشاطِ الم (سنجیدہ کلام کا مجموعہ) زیرِ نظر

۶. ترکش مزاحیہ مضامین کا مجموعہ زیرِ ترتیب مزاحیہ مجموعہ کلام

۷. سہانا سفر نعتیہ کلام کا مجموعہ زیرِ اشاعت

۸. بے نام سنجیدہ مضامین افسانے اور ڈراموں کا مجموعہ زیرِ غور

۹. دل کے رشتے انٹرویوز اور احباب پر مضامین زیرِ اشاعت

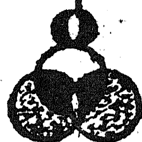
NISHATH-E-ALAM

BY: RAOOF RAHEEM



غم سے ملتا جنھیں سرور نہیں
زندگی کا انھیں شعور نہیں
(جگر)

نشاطِ الم



شعری مجموعہ



رؤف رحیم ایم اے